E-Content

Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India

Subject / Course - M.A

Paper : **Fun-e-Tareekhnawesi**

Module Name/Title : **History & Historiography: An Introduction**

DEVELOPMENT TEAM	
CONTENT	DDE SLM / Prof. Mushtaq Ahmed Kaw & Dr. Mahboob Basha
PRESENTATION	Prof. Mushtaq Ahmed Kaw & Dr. Mahboob Basha
PRODUCER	Mir Hashmath Ali

IMC MANUU
Instructional Media Centre
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 32
T.S. India
//imcmanuu

بلاک 1 تاریخ کی تفہیم — Understanding History

مندرجہ ذیل مضامین کے مجموعے (Set) میں تاریخی طریقۂ کار (Historical Methodology) سے متعلق کچھ بنیادی سوالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب ہم طریقۂ کار پر گفتگو کرتے ہیں تو ہم مؤرخ کے کارناموں میں موجود نادر یا سری رموز (Esoteric) پر بات نہیں کرتے۔ جو طریقۂ کار مؤرخین استعمال کرتے ہیں عام طور پر وہی طریقہ کار ایک عام آدمی بھی استعمال کرتا ہے جیسے اپنے اردگرد کے لوگوں اور چیزوں کے بارے میں ذاتی فیصلہ لینے میں یا ان کے بیانات میں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی مخصوص قسم کی تعمیم سازی اور سبب ومسبب کے تعلق پر منحصر ہوتی ہے جنھیں یا تو ہم اپنے مشاہدات کے بنا پر طے کرتے ہیں یا وہ دوسرے مشاہدین کی فراہم کردہ معلومات پر منحصر ہوتے ہیں۔ تاہم اس طریقے (Mode) اور مؤرخین کے تعمیم سازی اور تعلیلی تعلق (Causal Connection) کے قیام کے طریقے میں فرق یہ ہے کہ مؤرخین ماضی میں ہونے والی چیزوں کے بیان یا ان کے سلسلے میں کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے محتاط غور وفکر (Deliberation) اور تنقیدی شعور (Critical Conciousness) کا استعمال کرتے ہیں، وہ عام آدمی کی ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں کہ اس کی بلا واسطہ معلومات کیا ہے یا اس کے اردگرد کے لوگوں کی معلومات کیسی ہے۔ اس کام کے لیے مؤرخین مختلف قسم کے ثبوتوں کی تعین قدر (Evaluate) اور تفتیش کرتے ہیں۔ تنقیدی ذہن (Critical Mind) کا ہوش مندانہ استعمال تاریخ یا سماجی علوم میں مستعمل طریقۂ کاروں کو اس رویہ (Manner) سے متمائز کرتا ہے جس کے تحت ایک عام آدمی (Layman) عمومی صداقت کے بارے میں یا روزمرہ کی زندگی (Quotidian Life) میں علت ومعلول کے رشتوں کا تعین کرتا ہے۔

ابتدا میں ہم تاریخ میں تعمیم سازی کے طریقۂ کار کا جائزہ اور تعمیم سازیوں کے جواز (اکائی 1) اور تعلیلی تعلقوں کی جانچ پرکھ کریں گے۔ اس ذیل میں مصنفین نے ممکنہ حد تک سہل ترین طریقے سے تاریخ نویسی میں صدیوں میں تشکیل پانے والے اصولوں کی فلسفیانہ بنیادوں کی وضاحت کی ہے۔ تعمیم سازی کے ساتھ ہی تعلیل سے متعلق بیانات استدلالی نتائج پر منحصر ہوتے ہیں۔ ان استدلالی نتائج (Inferences) پر تنقیدی نظر جو اکثر ہمارے تحت الذہن میں غیر استدلالی مفروضوں (Assumptions) کی صورت میں پنہاں ہوتی ہے، اصولوں یا طریقہ کار کی تشکیل میں مواد کا مشکل مسئلہ ہوتی ہے۔ اولین دونوں مضمون ہمیں فیصلوں پر تنقیدی محاکمے کی ضرورت سے آگاہ کرتے ہیں کہ کیا چیز تعمیم پانے کے قابل ہے اور علت ومعلول کے رشتے کیا ہیں۔ تیسرا مضمون فیصلوں میں جانب دارانہ رویہ سے متعلق ہے۔ دوسرے لفظوں میں معروضیت کی ضرورت (اکائی ۳)۔ حالانکہ موجودہ دور میں معروضیت (Objectivity) کے امکان یا کسی بھی طرح کی مکمل معروضیت پر سوالیہ نشان قائم کیا گیا ہے، پھر بھی معروضیت پر عرصۂ دراز سے تاریخ کی صداقت کا دعویٰ منحصر ہے۔ اس مسئلے پر شاید تاریخ کے تنقیدی مخاطبے (Discourse) کے ذریعہ تقریباً معروضیت (Approximations) کے تواتر (Sequence) کے طور پر غور کرنا مفید ہوگا۔ ورنہ تاریخ لکھنا مشکل سے ہی دانشورانہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ ''نظریہ اور تاریخ'' اگلے مضمون میں مصنف نے اسی طرح کا سوال اٹھایا ہے (اکائی ۴)۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ماضی میں سماجی تشکیلات (Social Formations) معاون نظریوں کی حامل ہوتی ہیں اور انہیں قائم رکھتی ہیں جو تاریخ کی تشریح میں مخصوص میلان طبع کو پیدا کرتے ہیں، مصنف نے تاریخ کی مختلف سطحوں (Stages) پر نظریے کی طرز رسائی کے سروے کے دوران اس ذیل میں کارل مارکس کے تجزیہ پر توجہ مرکوز کی ہے۔ کل ملا کر بلاک ا میں شامل یہ مضامین تاریخ نویسی کے اس کورس میں کچھ بنیادی مسائل کو محققانہ طور پر پیش کرتے ہیں جن میں کچھ مروجہ تصورات اور بعد کے تجزیوں کے طریقوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

IMC LIBRARY Hyderabad-34

Generalisation — اکائی 1 تعمیم سازی

Structure — ساخت

Structure	ساخت	
Introduction	تعارف	1.1
What is Generalisation?	تعمیم سازی کیا ہے	1.2
Inevitability of Generalisation	تعمیم سازی کی لازمیت	1.3
Objections to Generalisation	تعمیم سازی پر اعتراضات	1.4
Role of Generalisation	تعمیم سازی کا کردار	1.5
Sources of Generalisation	تعمیم سازی کے ماخذ	1.6
How to Improve One's Capacity to Generalise	تعمیمی عمل کے لیے صلاحیت کو کیسے نکھارا جا سکتا ہے	1.7
Summary	خلاصہ	1.8
Exercises	مشقیں	1.9

Introduction — 1.1 تعارف

عملی طور پر مؤرخین کیسے اپنے کام کو انجام دیتے ہیں، اس کا سب سے اہم پہلو تعمیم سازی ہے یا بقول مارک بلاک (Marc Bloch) مورخین کیسے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ یہ ایک بہت پیچیدہ اور وسیع موضوع ہے جس میں مؤرخین کے ماہرانہ کام (Craft) سے متعلق تمام شعبوں کا احاطہ شامل ہوتا ہے۔ یہاں ہم خود کو صرف چند پہلوؤں تک محدود رکھیں گے۔

(1) تعمیم سازی کیا ہے؟ ہم سب تعمیم سازی کرتے ہیں کبھی کبھی یہ جانے بغیر کہ ہم ایسا کر رہے ہیں، تعمیم سازی کی مختلف سطحیں کیا ہیں؟

(ii) تعمیم سازی کیوں ضروری ہے؟ اور کچھ لوگ اس پر کیوں اعتراض کرتے ہیں؟

(iii) اس کا کردار یا استعمال کیا ہے، مؤرخین کی ہنرمندی (craft) میں یہ کس مقصد کو پورا کرتی ہے؟

(iv) ہم تعمیمی سرگرمی کہاں سے حاصل کرتے ہیں یا تعمیم سازی کے ماخذ کیا ہیں یا ہم اس کو بامعنی طور پر استعمال کرنا کیسے جانتے ہیں؟

(v) تعمیم سازی کرنے کے لیے ہم اپنی صلاحیت کو کیسے نکھار سکتے ہیں؟

What is Generalisation? — 1.2 تعمیم سازی کیا ہے؟

تعمیم سازی زمان ومکان میں موجود منتشر یا غیر مربوط حقائق (Facts) کی باہمی پیوستگی (Linkage) ہے۔ یہ ان کی گروہ بندی، عقلی درجہ بندی (Rational Classification) ہے۔ بنیادی طور پر تعمیم سازی حقائق کے درمیان اتصال (Connection) یا ہم رشتگی (Relationship) ہے۔ یہ ایک استدلالی نتیجہ ہے یا بقول مارک بلاک (Marc Bloch) مظاہر کے درمیان توضیحی رشتہ ہے۔ یہ وضاحت وتعلیل (Causation) تحریک (Motivation) اور اثر (effect) یا تاثیر (Impact) فراہم کرنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

موٹے طور پر، تعمیم سازیاں وہ ذرائع ہیں جن کے وسیلے سے مؤرخین اپنے مواد کی تفہیم کرتے ہیں اور حقائق کی اپنی تفہیم کو دوسروں کو بہم پہچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ واقعات (events) کا تجزیہ اور تعبیر وغیرہ امور میں تعمیم سازیاں لازمی طور پر ہوتی ہیں۔ تعمیم سازی وہیں سے شروع ہو جاتی ہے جیسے ہی ہم دو بالکل ابتدائی کام انجام دیتے ہیں:

حقائق یا مواد یا مظاہر کی درجہ بندی اوران کا تقابل وموازنہ یا ان کے درمیان مساوی امور (Similarities) یا غیر مساوی امور کی تلاش اوران سے کسی نتیجے پر پہنچنا۔

اس وقت ہم تعمیم سازی کرتے ہیں جب ہم اپنے حقائق کو سلسلے وار (Series) ایک کے بعد ایک رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم کسی رہنما کی نسل، ذات یا اس کا مذہب بیان کرتے ہیں، اس وقت ہم تعمیم سازی کرتے ہیں۔ رہنما یا مصنف کو نسل اور ذات سے وابستہ کرتے ہوئے ہم یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اس کی نسل اور ذات نے اس کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اسی طرح اس کے سیاسی یا ادبی کام میں بھی۔ اس کے عہد کو بیان کرتے ہوئے بھی ہمارا یہی مقصد ہوتا ہے۔ زیادہ جامع طور پر، ایک تعمیم سازی اس وقت ہوتی ہے جب ہم حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یا ماضی کے مواد (Data)، معروض (Object)، واقعات، ریکارڈوں کے درمیان تصورات کے ذریعہ اتصال پیدا کرتے ہیں اور تصورات کے سہارے ہی دوسروں کو ان کی ترسیل کرتے ہیں۔

تعمیم سازیاں سادہ یا پیچیدہ ادنیٰ یا اعلیٰ سطح کی ہوسکتی ہیں۔

ادنیٰ سطح (Low Level): ادنیٰ سطح کی تعمیم سازی وہ ہوتی ہے جب ہم ایک واقعے یا حقیقت پر کوئی نام ونشان چسپاں کرتے ہیں یا ان کی درجہ بندی کرتے ہیں یا اس کو کسی عہد سے وابستہ (Periodise) کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مبینہ حقائق پر اقتصادی لیبل لگانا یا مبینہ افراد پر ذات پات، علاقے یا مذہب یا پیشے کا لیبل لگانا یا یہ کہنا کہ واقعات ایک خاص برس یا صدی میں ہوئے۔

متوسط سطح (Middle Level): متوسط سطح کی تعمیم سازی وہ ہوتی ہے جب ایک مؤرخ اپنے زیر مطالعہ موضوع کے مختلف عناصر کے درمیان باہمی اتصال کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم زمان، مکان یا موضوع پابند کردار (Subject bound Character) کی سماجی حقیقت کے ایک حصے کا مطالعہ کرتے ہیں—— اس معاملے میں—— جیسے پنجاب میں کسانوں کی تحریک 1929 سے 1937—— مؤرخ آگے (Backword) اور پیچھے (Farword) کی کڑیوں (Linkages) یا اتصال کو دیکھنے کی اپنی انتہائی کوشش کرے گا لیکن وہ اپنے آپ کو سختی کے ساتھ اپنے موضوع کے نفس مضمون تک محدود رکھے گا۔ مرکزی تصورات (Themes) جیسے طبقاتی شعور، مفاداتی گروپ (Interest group)، سرمایہ داری (Capitalism)، قومیت پسندی (Nationalism) اور جاگیرداریت (Fudalism) سوائے متوسط سطح کی تعمیم سازیوں کے تحقیقی کام سے نہیں پرکھے جاسکتے۔ جیسے 1920 کو جمشید پور کے مزدوروں سے متعلق کرنا، 1930 میں ہندوستان میں صنعتی سرمایہ کاری کی نشوونما، 1930 میں ہندوستان میں مزدور قانون سازی (Labour Legislation)

وسیع تعمیم سازیاں یا منظم یا منصوبہ بند تعمیم سازیاں (Wide generalisations or systematising. or Schematsing generalisations) یہ تعمیم سازیاں اس وقت کی جاتی ہیں جب مؤرخین بڑے امکانی معنیٰ خیز رابطوں (Connections) یا دھاگوں (Threads) تک پہنچتے ہیں، جنھیں معاشرہ آپس میں باندھتا ہے۔ یہ مؤرخین ایک عہد میں ایک معاشرے کی تمام اقتصادی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ماحولیاتی کڑیوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مؤرخ ان کڑیوں سے ملک گیر یا سماج گیر یا عالم گیر تصویر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک محدود موضوع پر بھی اسی طرح کام کرتا ہے۔ زیادہ تر جب کبھی مؤرخ کسی محدود موضوع کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے ذہنی پس منظر میں وسیع تعمیم سازیاں موجود ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب کبھی ایک یوروپی محقق نے ایشیا یا افریقہ کے سماجی یا مذہبی مخصوص پہلوؤں کا مطالعہ کیا تو اس کے ذہن میں ایشیا یا افریقہ کی وسیع مشرقی فہم وفراست رہی۔ اسی طرح جب کبھی اس موضوع کا ایک برطانیہ کے محقق نے مطالعہ کیا یا آج وہ کسی ایشیائی ملک کی ایک مخصوص عہد کی اقتصادی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے پاس نوآبادیات کی ایک وسیع فہم وفراست ہوتی ہے۔

وسیع تعمیم سازیوں کی وسیع ترین شکل ایک سماجی نظام (جیسے سرمایہ داری) یا معاشرے کی صورت حال (جیسے جاگیرداریت، نوآبادیت) یا ایک نظام سے دوسرے نظام میں (جاگیرداریت سے سرمایہ داری میں، نوآبادیت سے مابعد نوآبادیت میں) منتقل ہونے کا مطالعہ ہے۔ وہ مؤرخین اور ماہرین سماجیات جنھوں نے اس طرح کی وسیع تعمیم سازیوں کو سرانجام دیا ہے ان میں سے چند نام ہیں کارل مارکس (Karl Marks)، میکس ویبر (Max

(Webur)، مارک بلاک (Mark Bloch)، فرنند براڈل (Fernand Braudel)، ارک ہابس بام (Eric Hobsbawm)، امنویل والرسٹین (Immanuel Wallerstein) اور ہندوستان میں ڈی ڈی کوسمبی، آر۔ ایس شرما، رومیلا تھاپر، عرفان حبیب۔

مہا تاریخ (Meta History): مہا تاریخ عام طور سے غیر تاریخی ہوتی ہے یعنی تاریخ کی ترتیب میں ایک اصول کا تاریخ کے باہر سے اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ اصول خود تاریخ کے ٹھوس مطالعہ سے نمودار نہیں ہوتا اس میں زیادہ تر واحد سبب یا ''تاریخ کا فلسفہ'' تمام تاریخی سلسلہ واقعات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرز رسائی کی مثال ہیں: ہیگل، اسپنگلر، ٹائن بی، یا ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کے موضوع پر عصر حاضر کے مصنفین۔

مارکسی اور ویبرین طرز رسائیاں مہا تاریخ کی مثال نہیں ہیں بلکہ یہ ٹھوس تاریخ، سماج، سیاست اور نظریات (Idelogy) وغیرہ کی عقلی توضیحات (Theories) ہیں۔ ان طرز رسائیوں کے عناصر ٹھوس تاریخ کے تجزیے کے ذریعے پرکھے جاسکتے ہیں۔ اگر مارکس اور ویبر کے اپنے بیانات اور ان کا ٹھوس تاریخی واقعات کا تجزیہ غلط ثابت بھی ہوتا ہے پھر بھی یہ طرز رسائیاں صحیح ہوسکتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر اسپنگلر اور ٹائن بی کے ذریعے کیا گیا کسی مخصوص واقعے کا تجزیہ غلط ثابت ہوتا ہے تو ان کا پورا نظریہ (Theory) یا طرز رسائی مٹی میں مل جاتی ہے۔

1.3 تعمیم سازی کی لازمیت Inevitability of Generalisation

تعمیم سازی ناگریز ہوتی ہیں۔ ہم سب انہیں کرتے ہیں یا ان کا استعمال کرتے ہیں، یہاں تک کہ جب ایک مؤرخ یہ سوچتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر رہا ہے، اس وقت وہ یہی کرتا ہے۔ تعمیم سازیاں الفاظ کی صحیح ترتیب میں خلقی (Inherent) ہوتی ہیں۔ یہ ایک خیال ہے کہ ''مؤرخ ماضی سے متعلق مواد جمع کرے اور اس کو زمانی سلسلہ ترتیب سے مرتب کرے'' جس کے بعد اس کے معنی از خود ظاہر یا نمایاں ہو جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں مؤرخ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مواد کی درستگی (Validity) کو پرکھے یا اس کے مستند ہونے کی تصدیق کرے، اسکی تشریح نہ کرے۔ بہ الفاظ دیگر یہی اس کی تعمیم ہے۔ اس کا مخالف زاویہ یہ ہے کہ ماخذ اپنے آپ معنیٰ منکشف نہیں کر سکتے، نہ ہی نوٹس (Notes) کا ایک ڈھیر، بھلے ہی کتنی احتیاط سے انھیں جمع کیا گیا ہو جو مؤرخ کو یہ نہیں بتا سکتے کہ اسے کیا لکھنا ہے۔

مواد کو عقلی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کرنا پڑتا ہے یعنی انتخاب، اہمیت، معنویت، مناسبت (Srelevence) کے کچھ اصولوں کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ ورنہ لیے گیے نوٹس مؤرخ کو ڈوبو دیں گے۔ اس تمام بنیادی حقیقت کی تین وجہیں ہیں۔

(1) اس وقت انتخاب ناگزیر ہوتا ہے جب حقائق بہت زیادہ ہوں، نتیجتاً ہر مؤرخ انتخاب کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہ کام کیسے کرتا ہے؟ مزید یہ کہ یہ سوال صرف حقائق کے انتخاب کا ہی نہیں بلکہ اس قیاس کا بھی ہے کہ مؤرخ کے سامنے پلیٹ میں وہی حقیقتیں سجی ہیں جیسا کہ وہ تھیں، حقیقت یہ ہے کہ مؤرخ کو ان کے لیے تلاش وجستجو کرنی پڑتی ہے اور وہ انتخاب کے کچھ اصول اختیار کرتا ہے۔

(11) دوسرے یہ کہ جمع کیے گیے حقائق کو مرتب کرنا ہوتا ہے اور ان کی گروپ بندی کرنا ہوتی ہے۔ یہ دونوں امور تعبیر اور علیت، تحریک اور تاثر پر دلالت کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ میں بطور علم (Descipline) تجزیہ بنیادی ہوتا ہے۔ درحقیقت سوائے انتہائی محدود شعور کے، ایک حقیقت صرف تعمیم سازی کے نتیجے میں ہی حقیقت ہوتی ہے۔

(الف) مثال کے طور پر، ایک زمیندار یا ایک کسان یا ایک غلام یا ایک سرمایہ دار ایک حقیقت کی طرح نظر آتا ہے لیکن یہ حقیقت تعمیم سازی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ صرف تجزیہ اور تعبیر کے بعد حاصل ہوتی ہے جو مؤرخ کے لیے ایک مقدمہ کا کام کرسکتی ہے۔

(ب) یا مردم شماری کے اعداد وشمار (Statistics) کو لیجئے۔ یہ حقائق کی طرح نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ پہلے ہی سے ان افراد کی تعمیم سازیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ان امور کے عنوانات (Headings) طے کرتے ہیں جن کے تحت ایک مردم شماری کرنے والا ان

اعداد وشمار کو جمع کرتا ہے۔

(ج) یا کسانوں کی اعداد وشماری کے سروے کو لیجئے۔ آپ کیسے ان کے طبقے یا ذات کا تعین کرتے ہیں؟ غریب کسان کون ہیں؟ ایک کاشت کار کون ہے؟ یا ایک زمیندار کون ہے؟ مردم شماری نے حالیہ برسوں میں لوگوں کی خواہش کے مطابق برہمن اور راجپوت نسلوں کے طور پر درجہ بندی پیش کی ہے۔ یو پی میں ایک نسلی گروہ اس بات پر بضد ہے کہ اسے لودھ راجپوت کہا جائے، لیکن جو خود کو پسماندہ طبقے میں بھی شامل کرتا ہے تا کہ اسے پسماندہ ذاتوں کو دی جانے والی خصوصی مراعات حاصل ہو سکیں۔

(د) حقیقت کی درجہ بندی یا اس کی نوٹنگ کے پس پردہ تعمیم سازی ہوتی ہے، برہمن تلک (یا بنیا گاندھی) کہنا پہلے سے ہی ایک تاریخی تعمیم سازی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس کا برہمن ہونا اس کی سیاست کے لیے اہم تھا۔ اس میں تحریک کا تمام نظریہ (Theroy) شامل تھا کہ لوگ اس تحریک میں کیوں شامل ہوں اور کیوں اس کی رہنمائی کریں اور یہ کہ سیاست میں ہندوستانیوں کا کردار وعمل کیا ہے۔ اس سے ہندوستان کی قومی تحریک میں برہمنوں کی فوقیت کے نظریہ کی طرف بھی رہنمائی ہوتی ہے۔

اس ذیل میں اس سیاق پر توجہ دینا اہم ہوتا ہے جس میں کوئی ذات ابھر کر سامنے آتی ہے، جیسے سیاسی، سماجی، تہذیبی، یا رواجی (Ritual)۔ کشمیری نہر و خطۂ کشمیر سے اپنی وفاداری کا حوالہ بن سکتے ہیں یا اس پر دلالت کر سکتے ہیں، ان کا کشمیری ہونا ان کی سیاست کے لیے معنی خیز تھا۔ یا آپ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی مثال لے سکتے ہیں۔ برطانوی حضرات نے عہد وسطیٰ کو مسلم حکمرانی کے بطور پیش کیا، اس بات پر دلالت کرتے ہوئے کہ حکمراں کا مذہب اس کی حکمرانی کے ماہیئت (Nature) کو طے کرتا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی حکمرانی کو عیسائی حکومت کے معنی میں بیان نہیں کیا۔ دوسری طرف اسی عہد کو جاگیرداری اور عہد وسطیٰ کے معنی میں بیان کرنا ایک مختلف قسم کی تعمیم سازی پر دلالت کرتا ہے۔ ہم ایک اور قریب کی مثال لے سکتے ہیں۔ پارلیامینٹری تقریروں میں تاریخ پر زور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ امور سیاست اور حکومت کی پالیسیوں کے سب سے اہم اور طے شدہ امور ہیں۔ ہر حال میں محفوظ حقائق (Record Facts) ریکارڈ کرنے والے افراد کے ذہنوں میں موجود تعمیم سازی کا ماحصل ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہ متعینہ شماریات (Statistics) کو کیوں اور کس کے لئے جمع کیا گیا ہے۔ آج اخبار کے ذریعے جو حقائق منظر عام پر آتے ہیں وہ نامہ نگار، ایڈیٹر یا اخبار مالکان کی تعمیم سازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(iii) جیسے ہی ہم ناموں یا تاریخوں (Dates) یا نری اعداد وشماری (Counting) سے باہر نکلتے ہیں ہر صورت میں تعمیم سازیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تعمیم سازیوں کے بغیر کوئی صرف مرتب (Compiler) ہو سکتا ہے (اگر چہ یہ اس طرح کا نہیں ہوتا جس کی ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں)۔ کوئی بھی پیچیدہ تجزیہ یا تعبیر تو کیا بلکہ اس کا بیان بھی تعمیم سازی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نا ہی ایک مؤرخ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ تعمیم سازیوں کے بغیر سطحی مظہر کے مقابلے میں گہرائی سے واقعات اور اداروں کی چھان بین کر سکے۔

(iv) لیکن تجزیہ اور تعلیل میں نظریے (Theories) یا تعلیلی اصول پہلے ہی سے کارفرما ہوتے ہیں۔ فلسفی سڈنی ہوک (Sudney Hook) کے مطابق ''ہر حقیقت (Fact) جسے مؤرخ قائم کرتا ہے کسی نہ کسی نظریاتی ساخت (Theoretical Construction) پر منحصر ہوتی ہے''۔

یہ مؤرخین کے لیے ایک دوسرا مثبت نتیجہ ہے۔ لیکن جب نئے حقائق دریافت نہیں ہوتے تو پھر بھی دو یا زیادہ مؤرخ ایک مرکزی تصور یا موضوع پر کام کر سکتے ہیں۔ وہ ایک ہی مواد پر نئی تعمیم سازیوں کے توسط سے کام کر سکتے ہیں۔ یہ عمل دور قدیم یا دور وسطیٰ کے مؤرخین کے لیے خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ حتیٰ کہ نئے ماخذ اور نئے مواد کی عدم موجودگی بھی میں نئی طرز رسائیاں اور تعمیم سازیاں نئی تحقیق منظر عام پر لا سکتی ہیں۔

1.4 تعمیم سازی پر اعتراضات Objections to Generalisation

کچھ لوگ تعمیم سازی پر اعتراض کرتے ہیں ان کے اعتراضات تین قسم کے ہیں۔

(i) پہلا اعتراض اس خیال (Notion) پر مبنی ہے کہ حقائق اور تعمیم سازیوں میں فرق و امتیاز کیا جائے اور ان تعمیم سازیوں کو حقائق سے ہی متخرج ہونا چاہیے۔ ہم اس اعتراض کا جواب پہلے ہی دے چکے ہیں اور اس امر کی نشاندہی کر چکے ہیں کہ حقائق تعمیم سازیوں کے وسیلے ہی سے حقائق بنتے ہیں۔

(ii) یہ کہا جاتا ہے کہ ہر واقعہ بے نظیر ہوتا ہے اور اس کی انفرادیت اسی کے اندر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق سماج جو جوہریت پسند (Atomistic) ہے جس میں کوئی یکسانیت (Uniformity) نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خاص کر بے نظیری (Uniqueness) تقابل و موازنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہم بے نظیری کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم جانی ہوئی چیزوں سے اس کا تقابل و موازنہ نہ کرلیں۔ بصورت دیگر بے نظیری ناقابل تفہیم اور ناقابل تصور ہوگی۔ مؤرخ ہر صورت میں بے نظیری اور عمومیت کے درمیان رشتوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی قومی انقلاب بے نظیر ہے لیکن اس کی بے نظیری صرف اسی وقت سمجھی جاسکتی ہے جب دوسرے معلوم انقلابات سے اس کا تقابل و موازنہ کرلیا جائے۔

(iii) اکثر ناقدین درحقیقت ان تعمیم سازیوں کو نشانہ بناتے ہیں جن کا کردار حضوری (Apriori) ہوتا ہے اور جو تاریخی حقیقت پر منڈھ دی جاتی ہیں۔ یہ ناقدین غلط نہیں ہیں۔ بہت سے لوگ ایک تعمیم کو ایک دعوے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ثابت ہے جب کہ اسے ثابت ہونا ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سی تعمیم سازیوں کی خاطر خواہ جانچ پرکھ نہیں ہوتی۔ بہت سی تعمیم سازیاں مواد کی حد سے زیادہ تسہیل، رشتہ سازی اور تعلیل پر مبنی ہوتی ہیں۔ جبکہ کچھ انتہائی احمقانہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس سوال کا جواب: افریقہ کا مطالعہ کیوں کیا جائے؟ کیونکہ وہ تو وہاں ہے یا یہ کہ کچھ ممالک فوجی انقلابات (Military Coups) جھیل رہے ہیں اس لیے دیگر ممالک بھی اس سے دوچار ہیں (یہ الگ بات ہے کہ ایک ملک کے واقعات دوسرے ملک پر اثر انداز ہوں)، یا یہ کہ چونکہ جاگیردارانہ نظام نے ایک مصالحت پسند (Comprador) سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا اس لیے ہر نوآبادیاتی ملک کا سرمایہ دار طبقہ مصالحت پسند (Comprador) تھا، یا یہ کہ جب دیگر قوم پسند انقلابات پر تشدد تھے اس لیے ہندوستانی قومی انقلاب بھی پر تشدد تھا، یا یہ کہ عالم کاری (Globalisation) کچھ ممالک میں پسماندگی کا باعث ہے اس لیے لازمی طور پر تمام ممالک میں یہی صورت ہے۔ یہ تمام اعتراضات کچھ تعمیم سازیوں کے غیر سائنسی اور غیر منطقی کردار پر منطبق ہوتے ہیں، یا یہ اس طریقہ کار کی تنقید ہیں جس کے وسیلے سے وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

درحقیقت اصلی مسئلہ اس سے مختلف ہے جسے ذیل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(الف) تعمیم سازیاں واضح اور صریح ہونا چاہئیں تاکہ ان پر کھلی بحث ہوسکے

(ب) بنیادی مسئلہ تعمیم سازی کی سطح اور اس کی نوع کا ہے۔

(ج) تعمیم سازی کی صحت کا درجہ (Degree) یا عارضی پن (Tentativeness) یا صداقت کا درجہ اور کس طرح کے ثبوت اس کی صحت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

(د) ایک فرد کو یہ مطالعہ کرنا چاہیے کہ تعمیم سازیاں کس طرح کی جاتی ہیں اور یہ سیکھنا چاہیے کہ وہ اندرونی رشتے قائم کرنے کی اپنی صلاحیت کو کیسے نکھار سکتا ہے۔ جو اس کے لیے بہتر یا زیادہ مستند اور افادی ہوں (یعنی ان کا جواز اور مناسبت) دوسرے الفاظ میں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک خاص مؤرخ ایک اچھا مؤرخ ہے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ مؤرخ تکنیکی مہارت اور دیانت داری کے علاوہ بہتر رابطے (Connection) بناتا ہے اور تعمیم سازی کرتا ہے۔

1.5 تعمیم سازیوں کا کردار — Role of Generalisations

اس تفاعل کے علاوہ جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، تاریخ کے طلبا کے لیے تعمیم سازیاں مزید متعینہ فوائد (Advantage) کی حامل ہوتی ہیں۔

(i) یہ مواد کی ترتیب و تدوین کے اصولوں (Organising Principles) کی حیثیت سے کارنمایاں انجام دیتی ہیں اس طرح یہ مؤرخ کے

بنیادی مسئلے کو حل کرتی ہیں جس کے نوٹس میں بڑی تعداد میں بکھری ہوئی حقیقتیں ہوتی ہیں جس کو یہ معلوم نہیں کہ انہیں کس ترتیب میں رکھا جائے۔ (vii)

(ii) یہ مؤرخ کے فہم وادراک کو بہتر بناتی ہیں یا اس کی نظر میں وسعت پیدا کرتی ہیں۔ یہ مؤرخ کی حقیقت کے مسلسل بڑھتے ہوئے میدان پر دسترس حاصل کرنے اور گہرے رابطے (Connection) قائم کرنے صلاحیت میں اضافہ کرتی ہیں۔

(iii) یہ مؤرخ کو اس لائق بناتی ہیں کہ وہ نتائج برآمد کر سکے اور علت ومعلول اور اثر کی کڑیوں کو ملا سکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اسے تجزیہ، تعبیر اور خاص زمانے کی وضاحت کرنے کے قابل بناتی ہیں۔

ایک مؤرخ اپنے تحقیقی کام میں شش کاف کا استعمال کرتا ہے، کون(Who) یا کیا(What)، کب (When)، کہاں (Where)، کیسے (How) اور کیوں (Why)۔ راست حقیقتیں (یعنی ادنیٰ سطح کی تعمیم سازی) ہمیں زیادہ تر کون (Who) یا کیا (What) کب (When) اور کہاں (Where) سے پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب دینے کے قابل بنا سکتی ہیں لیکن کیسے (How) اور کیوں (Why) کے جواب فراہم نہیں کرسکتیں۔ ان سوالوں کے جواب کے لیے وسیع تعمیم سازیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(iv) خاص طور پر تعمیم سازیاں مؤرخ کو نئی حقیقتوں اور ماخذ کی طرف راجع کرتی ہیں۔ زیادہ تر نئے ماخذ صرف نئی تعمیم سازیوں کے ذریعے ہی صحیح طور پر سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اکثر اس عمل میں دوسرے طریقے بھی شامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر نئے مواد کی تلاش میں نئی تعمیم سازیاں محرک کا کام کرتی ہیں۔

(v) تعمیم سازیاں ہی مؤرخ کو نئی اور پرانی معلوم حقیقتوں کے درمیان نئے رابطے (Connections) قائم کرنے کا اہل بناتی ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے پرانی حقیقتوں پر نئے سرے سے روشنی ڈالی ہے اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ اس مؤرخ نے معلوم حقیقتوں کی تفہیم کے لیے نئی تعمیم سازیوں کا استعمال کیا ہے۔

(vi) تعمیم سازیاں مؤرخ کو تجربیت (Empiricism) یا لفظی معنویت سے دامن کشا ہونے میں مدد کرتی ہیں جو ماخذ کو اسکے ظاہری معنی (Face Value) یا لغوی معنی میں استعمال کرتی ہیں۔ اس کے بجائے یہ ان کی معنویت (Significance) اور موزونیت (Relevance) کو بیان کرنے میں مؤرخ کی رہنمائی کرتی ہیں، مثال کے طور پر دادا بھائی نیروجی کے بیان کو لیجیے جو (برطانوی) بیرونی حکومت اور بیرونی سرمائے کے استعمال سے متعلق ہے۔ تعمیم سازیوں کے بغیر ان کے بیانات کو ظاہری معنی (Face Value) میں لینے اور انہیں ایک کے بعد ایک تاریخی ترتیب میں نقل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ یا مؤرخ نیروجی کی طرز رسائی کو عمومی بنا سکتا ہے اور اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ کس طرح ان کے تمام بیانات اس تعمیم سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تعمیم سازیاں بہت پیچیدہ ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مؤرخ کو غور وفکر کے مختلف مراحل یا سطحوں پر علیحدہ علیحدہ تعمیم سازیاں کرنا پڑیں۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مؤرخ کو وہ کہنا پڑے جس سے ان کے نظریہ اور عمل میں اختلاف ظاہر ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مؤرخ کو یہ کہنا پڑے کہ ان کی فکر عمومی اور مسلسل طور پر غیر منظم اور غیر مرتب ہے۔ اس کے بعد کوئی یہ تعمیم سازی کرسکتا ہے کہ نیروجی پریشاں خیال (Confused) اور بے ربطگی کا شکار تھے۔ بہرصورت یہ عمل اس تاثر پر قائم ہوگا کہ لفظی معنویت (Literlism) کو اپنایا جائے۔ دوسری صورت میں تعمیم سازی مؤرخ کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ تعبیر میں مختلف زاویوں کو مدنظر رکھے، ان کے مباحث کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرے۔

نیروجی کے سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابتدائی عہد میں (ابتداء سے 1870 تک) برطانوی حکومت کے پرستاروں میں تھے اور اس کے بعد انھوں نے برطانوی حکومت پر تنقید کرنا شروع کی اور اسے اقتصادی نشونما کی راہ میں رکاوٹ اور ہندوستانی کی غربت کی وجہ قرار دیا۔ اسی طرح ہم یہ نشاندہی کرسکتے ہیں کہ وہ ابتدائی عہد میں بیرونی سرمائے کے استعمال کے حامی تھے اور بعد میں، 1873 کے بعد انھوں نے اس کی آمد کی مخالفت شروع کی، ہم ان کے نقطۂ نظر میں ہونے والی اس تبدیلی کا تجزیہ بھی کرسکتے ہیں۔

یہاں ہم تعمیم سازیوں کے استعمال کے فوائد ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ نیروجی کی آراء (Opinions) کی محض قراءت (Recitation) ہمیں اس لائق نہیں بناتی ہے کہ ہم انہیں سمجھ سکیں یا ان کی اقتصادی فکر کا تجزیہ کرسکیں، یہ صرف ان کے نقطۂ نظر کی تلخیص یا ترتیب کے مترادف ہے۔

(vii) تعمیم سازی ایک مؤرخ کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ مستقل اپنی کہی ہوئی باتوں کو پرکھتا رہے۔

(الف) نظریاتی پلان کے طور پر: جیسے ہی کوئی فرد شعوری طور پر لوگوں یا واقعات کی درجہ بندی یا نوع بندی یا ان میں بین ربطگی پیدا (Interrelates) کرتا ہے، تو وہ تعمیم سازیاں کرتا ہے، وہ اپنے آپ اس تہہ تک پہنچ سکتا ہے کہ اس کے معنی یا اس کی مناسبت کیا ہے۔

(ب) جیسے ہی کسی فرد نے تعمیم سازی کی، تو وہ ان حقائق کو تلاش کرنا شروع کرتا ہے جو اس کی ضد ہو سکتے ہیں یا وہ دوسرے کنارے کو تلاش کرتا ہے۔ بغیر تعمیم سازی کے کوئی ان حقائق کی تلاش و جستجو نہیں کرتا جو کسی کے نقطۂ نظر کے برخلاف ہوتے ہیں، درحقیقت کوئی متضاد حقیقتوں کو بھول سکتا ہے حتیٰ کہ وہ ظاہری صورت میں اس کو نظر جما کر دیکھتی ہیں۔ تاریخ کے علم (Historical Discipline) میں متضاد حقیقتوں کی تلاش و جستجو بنیادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اکثر اس عمل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

آیئے دادا بھائی نیروجی کی مثال پر واپس چلتے ہیں، جیسے ہی میں نے ان کے برطانوی حکومت پر تنقیدی تبصرے کے بارے میں تعمیم سازی کی تو مجھے یہ سوال کرنا پڑیگا کہ وہ کیسے اس تنقید کو برطانوی حکومت کی ستائش کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہیں۔ یا وہ اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کرتے ہیں؟ اگر میں ان کے بیانات کو صرف مرتب کر رہا ہوں تو مجھے تضادات کو تلاش کرنے یا ان کی تعبیر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر میں ان کے بیرونی سرمائے سے متعلق رویہ (Attitude) کو تعمیماتا ہوں تو میں متضاد مثالوں کی تلاش شروع کروں گا۔ اگر میں انہیں مرتب کر رہا ہوں تو اسکی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری مثال گاندھی جی کے مذہب اور سیاست کے رشتوں سے متعلق بیانات ہیں۔ جیسے ہی میں تعمیم سازی کرتا ہوں تو میں متضاد بیانات کی تلاش شروع کرتا ہوں، اس طرح کے دوسرے بیانات ان کے ان بیانات پر روشنی ڈالیں گے۔

(ج) درحقیقت اکثر دوسروں کے تعمیمیائے ہوئے مسئلے یا موضوع پر مؤرخ کی تازہ تحقیق ایک مزید پیش رفت ہوسکتی ہے۔ بنیادی طور پر یا اکثر وہ ماقبل کی تعمیم سازیوں کو موجودہ یا تازہ ثبوتوں کے ساتھ جانچ پرکھ کر کے مستقل ان پر نظر ثانی کرتا ہے اور ان کی نفی یا ان کی تصدیق کرتا ہے۔ مؤرخ کا کام اس وقت آسان ہو جاتا ہے اگر وہ اپنی تعمیم سازیاں جامع و مانع کرتا ہے، ان تعمیم سازیوں کے ساتھ جن کی وہ جانچ پرکھ کر رہا ہے۔

مختصر یہ کہ تعمیم سازیاں ہماری رہنمائی کرتی ہیں، یہ ہمیں ان حقائق پر شک و شبہہ کرنے کے قابل بناتی ہیں جیسا کہ وہ ظاہر ہوتے ہیں یا جیسا کہ انہیں معاصرین یا بعد کے مصنفوں نے بیان کیا ہے، یہ پرانے حقائق کی نئی امکانی تفہیم کی طرف ذہن کو منتقل کرتی ہیں، یہ تصدیق، ابطال، آئندہ ترقی اور موجودہ زاویوں کی مزید استعداد کے لیے تازہ نقاط نظر اور زاویے پیش کرتی ہیں۔

تعمیم سازیاں ایک تاریخ کے طالب علم کی مرکزی تصور کی تعریف کرنے میں مدد کرتی ہے۔ وہ چاہے ایک مضمون، ٹیوٹوریل، تحقیقی مقالہ یا ایک کتاب ہو۔ یہ اسے ایک کتاب، ایک مضمون یا ایک ابتدائی ماخذ سے نوٹس لینے کے لائق بناتی ہیں۔

درحقیقت تاریخ کے ایک طالبعلم کا مضمون یا مقالہ تعمیم سازیوں کا ایک سلسلہ (Series) ہوتا ہے، اسے ان کی جانچ پرکھ کرنا ہوتی ہے، چاہے وہ انہیں بیانات کی طرح پیش کرے یا سوالات کی طرح۔ تعمیم سازیاں اس کو یہ سمجھنے کا اہل بناتی ہیں کہ اس کے نوٹس میں کیا چیزیں اس کے مرکزی تصور یا اس کی تحقیق کے نفس مضمون سے مناسبت رکھتی ہیں یا اس کے لیے معنی خیز ہیں۔ تعمیم سازیاں ایک محقق کو مطالعہ کیے جانے والے مواد پر ردعمل ظاہر کرنے کے بھی قابل بناتی ہیں۔ یہ کام وہ صرف اس وقت کر سکتا ہے اگر وہ مطالعے کے دوران تعمیم سازی کر رہا ہے۔ تعمیم سازیاں مؤرخین کے درمیان مباحثے کی راہ ہموار کرتی ہیں بصورت دیگر ان کے درمیان ایک دوسرے کے کاموں پر ردعمل واقعی غلطیوں کا اشاریہ ہوتا ہے۔ تعمیم سازیاں مؤرخین کی اس طرح رہنمائی کرتی ہیں کہ وہ مسائل کو بحث و مباحثہ کے لیے پیش کریں اور ان سے ایک نتیجہ خیز مباحثے کی شروعات کریں۔ کچھ مؤرخ دوسرے مؤرخین کے کاموں میں پیش کی گئیں تعمیم سازیوں سے اتفاق کرتے ہیں اور ان سے غور و فکر اور تحقیقی کاموں میں نئی روشنی حاصل کرتے ہیں جبکہ کچھ دیگر ان سے اتفاق نہیں کرتے اور بحث کے دوران مظاہر کی مختلف تعبیریں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مختلف شواہد تلاش کرتے ہیں۔ تعمیم سازیاں اس طرح نئے

معاون یا باہمی مختلف پختہ شواہد کی تحقیق کو فروغ دیتی ہیں۔ہم سمینار میں پیش کیے گیے مقالہ پر گفتگو کرتے ہیں۔اگر اس میں کوئی تعمیم سازی نہیں ہے تو وہ بحث کا کوئی موقع فراہم نہیں کرسکتا۔سمینار میں حصہ لینے والے مقالے میں پیش کیے گیے حقائق کو رد کر سکتے ہیں یا اس میں اضافہ کر سکتے ہیں۔تعمیم سازیوں کی عدم موجودگی ہی کچھ ہندوستانی تاریخی تحریروں کے بے رس کردار کا سبب ہے،ان میں قاری کے ردعمل کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

1.6 تعمیم سازی کے ماخذ Sources of Generalisation

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ابتدائی مرحلے میں تعمیم سازیوں کے اشتقاق کے لیے کوئی عام اصول یا معیاری طریقۂ کار (Standard Procedure) موجود نہیں ہوتا۔تاہم اس مقصد کی حصولیابی کے لیے متعدد ماخذ موجود ہوتے ہیں۔

(i) ایک بڑا ماخذ کسی بھی موضوع سے متعلق ماقبل کی تحریریں ہوتی ہیں جو اکثر مختلف قسم کی تعمیم سازیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔

(ii) دوسرا بڑا ماخذ دیگر سماجی علوم پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً انفرادی کردار (Behaviour) اور تحریکات سے متعلق تعمیم سازیاں یا گروہی کردار یا ہجوم کا کردار، روایت کا کردار (Role)، خاندان کا کردار، نسلی منظرنامہ اور کردار، اقتصادی نظریہ اور تاریخ، سیاسی نظام کا تفاعل، سماجی بشریات، (خصوصاً قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کے لیے) لسانیات، وغیرہ سے متعلق تعمیم سازیاں۔تعمیم سازیوں کے یہ ماخذ اس اعتبار سے خاص طور پر اہم ہیں کہ انہوں نے علم تاریخ (Historical discipline) کی فطرت (Nature) کو پچھلے پچاس سال میں تبدیل کر دیا۔اب تاریخ میں جنگ وجدال اور حکمت عملی (diplomacy) کے معنی یا اعلیٰ طبقات یا حکمراں جماعت یا مرد اساس نقطہ نظر ہی دکھائی نہیں دیتا۔یہ اب بڑی حد تک سماج، اقتصادیات، بڑی سیاسی تحریکات، ثقافت، روزمرہ کی زندگی، دبے کچلے، حاوی اور حاشیائی (Mrginal) گروہوں جیسے عورتیں، نچلی ذاتیں اور قبائلی گروہ، ماحولیات، ادویات، کھیل کود وغیرہ کے مطالعے سے سروکار رکھتی ہے۔

(iii) تاریخ، سماج، ثقافت اور سیاست سے متعلق نظریات (Theories) جیسے مارکس ویبر اور فرائڈ کے نظریے تعمیم سازیوں کے ایک بڑے ماخذ ہیں۔

(iv) مؤرخین عہد حاضر کے مطالعے سے بھی تعمیم سازیوں کا استخراج کرتے ہیں۔جیسے دلت اور دیگر نسل مخالف گروہوں کی تحریکات اور قبائلی لوگوں کی تحریکات۔اسی طرح عام بے چینی (Popular discontent) اور مخالف تحریکات ہندوستانی قومی تحریک سے براہ راست وابستہ بہت سی تعمیم سازیوں کو نمایاں کرسکتی ہیں۔

(v) بہت سی تعمیم سازیوں کا استخراج زندگی سے ہوتا ہے۔

(الف) عقل عامہ (Common Sense) ان کا ایک بڑا ماخذ ہوتی ہے۔درحقیقت وہ مؤرخ جو تعمیم سازیوں کے حصول میں شعوری عمل کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے وہ اپنی عقل عامہ کو تعمیم سازی کے مروجہ ماخذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

(ب) ایک دوسرا بڑا ماخذ مؤرخ کا ذاتی یا پوری زندگی کا تجربہ ہوتا ہے۔یقیناً یہ تجربہ کئی عوامل کی وجہ سے محدود ہوتا ہے جیسے اس کی حرکت وعمل کا میدان، اسکی زندگی کی خصوصیت، اس کا معیار اور مرتبہ، اس کی تعلیم وتربیت اور پرورش۔اس رجحان کی ایک مثال کچھ مؤرخین کی ہیں جو گروہوں، جماعتوں یا افراد کے درمیان سیاسی جدوجہد کو خاندانی لڑائی جھگڑوں یا حکومت یا کمپنی کے دفاتر کے جھگڑوں کے روپ میں دیکھتے ہیں۔

(vi) ہم تعمیم سازیوں کا استخراج بالفعل مواد کی جمع آوری سے بھی کرتے ہیں، وہ ہے ماخذ کا منضبط تجزیہ (Systamatic Analysis)۔تاہم یہ طریقہ تعمیم سازیوں کے حصول میں زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتا بلکہ تعمیم سازیوں کی جانچ پرکھ میں معاون ہوتا ہے۔دوسرے الفاظ میں کوئی پہلے نوٹس لیتا یا جمع نہیں کرتا ہے اور پھر ان کو تعمیما تا ہے بلکہ وہ مسلسل طور مطالعے کے دوران نوٹس کے شواہد پر رائے زنی کرتا ہے۔یہ نقطہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نوٹس لیتے وقت ایک طالب علم یا محقق کو مفعولی ریکارڈ کی حیثیت کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی شمولیت فعال ذہن کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اس طرح تعمیم سازی کرنے یا انہیں تخلیق کرنے کی مہارت کا حصول ایک فعال ذہن کے ذریعے سب سے بہتر طور پر ہوتا ہے۔ ہر چیز کو کرنے میں کوئی اسی طرح ہی تصحیح و درستگی کرنا سیکھتا ہے جیسے ایک بچہ۔ ایک بچہ بھی رابطے قائم کرتے ہوئے بہت سے احمقانہ سوالات پوچھتا ہے، جن میں سے اکثر بعد میں ترک ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کسی ایک نئے آدمی سے ملتے ہی پوچھتا ہے، یہ انکل کون ہیں؟ وہ انکل کون ہیں؟ ان کی بیوی کہاں ہیں؟ یہ اپنے بچوں کو ساتھ میں کیوں نہیں لائے؟ آپ ان کے ساتھ میں کھانا کھانے کو کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ ان کو Sir کیوں کہتے ہیں جبکہ دوسرے انکلس جو آپ سے ملاقات کرتے ہیں انہیں نہیں کہتے؟ آپ انہیں مشروب کیوں پیش کرتے ہیں جبکہ دوسروں کو نہیں کرتے؟ یہ گورے یا سفید کیوں ہیں یا ان کے داڑھی کیوں ہے؟ وغیرہ۔ ایک بچے کے سوالات معاشرہ کے بہت سے پہلوؤں کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ ایک مؤرخ کو متجسس بچے کی طرح بننا پڑتا ہے۔ اس طرح اگر کوئی ماخذ وغیرہ پر ایک بچے کی طرح ردعمل ظاہر کرتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یا نوٹس لیتے ہوئے سوالات اور تعمیم سازیاں قائم کرتا ہے، تو اس کا تھیسس (Thesis) کامیابی سے آگے بڑھتا رہے گا۔ اس طرح تعمیم سازی بنیادی طور پر ایک ربط (Connection) ہے، جو کسی کے ذہن میں کسی بھی وقت پیدا ہو سکتی ہے خصوصاً اس وقت جب اس کے ذہن میں ہر وقت کوئی موضوع حاوی ہو۔ بہت سے امکانی رابطے یا تعمیم سازیاں کسی کے ذہن میں اُس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ موضوع (Subject) کا مطالعہ کرتا ہے یا نوٹس لیتا ہے، یا اس کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے۔ ان میں بہت سی باتیں بعد میں ترک کردی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ باقی رہ جائینگی جو اس کے تھیسس (Thesis) یا تحقیقی مقالے کی بنیاد تشکیل کرتی ہیں۔ یہ اس کی اصلی خدمت (Contribution) کا جز ہوں گی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک مؤرخ اصلیت کا حامل ہے اور اس کے پاس کچھ نیا کہنے کے لیے ہے تو اس سے مراد یہی چیزیں ہوتی ہیں۔

1.7 تعمیمی عمل کے لیے صلاحیت کو کیسے نکھارا جاسکتا ہے۔

How to Improve One's Capacity to Generalise

یا کس طرح کوئی پنہاں گہرے رابطوں کو سمجھنے کی یا ان کی حصولیابی کی صلاحیت کو نکھارتا ہے اور ظاہری و سطحی رابطوں پر بھروسا نہیں کرتا؟ یہ شاید بہت ہی وسیع میدان ہے اور ان دونوں سوالوں کے جواب عارضی اور ناکافی ہیں۔ ایک قاری کے پاس اپنی صلاحیت کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے۔

ہماری بات کے آغاز سے یہ مسئلہ پھر اٹھتا ہے تاکہ کچھ نہ کچھ جواب فراہم ہو۔ تعمیم سازیوں کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد، یہ ضرورت ہماری طرز رسائی یا ذہنی ساخت بننا چاہئے۔ واقعات اور چیزوں کے درمیان رشتہ سازی اور کڑیاں تلاش کرنے کی عادت انگیز کرنا چاہیے۔ یہ عادت نہ صرف تحقیق کے دوران ہو بلکہ روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں تعمیمی اور تصوراتی ذہن کا اکتساب کرنا چاہیے۔

(i) جب تعمیم سازیاں بطور نظریات کے فہم میں آجائیں تو نظریات پر دسترس حاصل کرنے کی صلاحیت انگیز کرنا چاہیے اور اسے نکھارنا چاہیے نظریات پر دسترس حاصل کرنا سیکھنا چاہیے خواہ ابتدا میں اس کا یہ کام کتنا بھی کمزور ہو، اسے بیان محض کے بجائے مسلسل طور پر اپنے مسائل کی نظریاتی تشکیل کرنا چاہیے۔ بیان کرتے ہوئے اسے اپنے مواد پر کلی کی ایک مثال کے بطور نظر ڈالنا چاہیے خواہ وہ کتنی ہی کمتر سطح کی ہو۔

(ii) اس کو منطقی اصولوں کو استعمال کرنا سیکھنا چاہیے۔ اسے منطقی مغالطے جیسے دائرہ جاتی استدلال (Circular Reasoning) کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ ایک سوال کو مثبت انداز سے دوبارہ بیان کرنا اس کا جواب نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ لکڑی پانی میں کیوں تیرتی ہے؟ اس کا یہ جواب کہ لکڑی میں پانی پر تیرنے کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ یہ صرف سوال کی محض مثبت شکل ہے۔ اس طرح یہ سوال کہ اکبر ایک بڑا حکمراں کیوں تھا؟ کیوں کہ وہ حکومت کرنا جانتا تھا، اس سوال کا جواب نہیں ہے۔

(iii) زبان مؤرخ کی بنیادی آلۂ کار ہوتی ہے۔ اس کو اپنے تفکر یا تحریر میں واضح زبان استعمال کرنا چاہیے، چاہے وہ کتنی ہی سادہ ہو۔ مبہم زبان سے صفائی یا خیالات کی گہرائی ظاہر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سی۔ رائٹ نے ساختیات کے ذیل میں نشاندہی کی ہے کہ مابعد جدید اور ساختیاتی زبان اس طرح کے ابہام کے اولین نمونے ہیں۔ یہاں تک کہ مابعد جدیدیے اور ساختیاتی جو بصیرت بھی بہم پہونچاتے ہیں اس کے ساتھ بھی ان کا یہ عمل غیر منصفانہ ہے۔ ان دونوں کی زندگی اور خدمات اسی وقت باقی رہیں گی جب ان کے مویدین صفائی و سادگی کے ساتھ عام فہم زبان میں بات کرنے کا ہنر سیکھیں گے۔

(iv) اس کوان چیزوں کا منظم طریقے سے مطالعہ اور جائزہ لینا چاہیے جن پر مؤرخین اظہار خیال کرتے ہیں۔

(v) تصورات اور تعمیم سازیوں کو جلا دینے کا عمل لگا تار چلتا رہتا ہے۔اس لیے دوستوں اور رفیق کاروں کے ساتھ ان پر مباحثے اور لیکچروں کی اہمیت مسلم ہے ۔نظریات وخیالات کی شائستگی اور تعمیر وترقی میں تبادلۂ خیال کا عمل ہر صورت میں اہمیت کا حامل ہے ۔تبادلۂ خیال بغیر تصور گری (Conceptuatisation) کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔مثال کے طور پر اگر ایک فلم پر بحث ہوتی ہے تو لوگ انہیں مثالوں پر ہی اکتفا نہیں کر سکتے کہ کسی اداکار نے کیا کہا اور کیا کیا۔ وہ لازمی طور پر مکالموں کی خصوصیت اور ان کی ادائیگی پر گفتگو کریں گے،اداکاری کے دوسرے پہلو اور فلم کی ہدایت کاری پر بھی بات کریں گے۔

(vi) اس کو نئے خیالات کو ناقدانہ طور پر قبول کرنے کی صلاحیت انگیز کرنا چاہیے۔کوئی نئے خیالات کو صرف اس لیے قبول نہیں کرتا ہے کہ وہ محض نئے ہیں (خیالات نئے کپڑوں کی طرح نئے نہیں ہوتے) بلکہ اسے ان خیالات پر بحث کرنا چاہیے،اس کا جائزہ لینا چاہیے،ان پر استدلال کرنا چاہیے اور اگر وہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں تو انہیں قبول کرنا چاہیے یا بصورت دیگر رد کر دینا چاہیے۔

(vii) اسے اپنے موضوع سے متعلق ماقبل کی تعمیم سازیوں کا علم ہونا چاہیے۔تنقیدی جائزہ کے بعد ان سے استفادہ کر کے اپنی صلاحیت میں اضافہ کرنا چاہیے۔کل ملا کر عہد ماضی کے اور معاصر مؤرخین کی نسل کا تاریخیاتی مطالعہ (Historiographic Study) اشد ضروری ہے۔زیادہ تر ہم نئی تعمیم سازیوں کی تخلیق یا ان کی افزائش نہیں کرتے ہیں بلکہ پہلے کی تعمیم سازیوں میں ترمیم واضافہ کرتے ہیں،کبھی انہیں ادنیٰ سے اعلیٰ اور کبھی اعلیٰ سے ادنیٰ بناتے ہیں۔یہ کام سبھی مؤرخ کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ہم نے اے۔آر۔ڈیسائی کی تعمیم سازیوں کی ہندوستانی قومیت پسندی کے سماجی پس منظر میں جانچ پرکھ شروع کی کہ میانہ رو قومیت پسند ہندوستان کے تجارتی بورژوا ادیوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہم نے بتدریج اس تعمیم سازی کی نشوونما کی کہ وہ ابھرتے ہوئے صنعتی بورژوا طبقے کی نمائندگی کر رہے تھے۔اسی طرح 19 ویں اور ابتدائی 20 صدی کے زیادہ تر ہندوستانی مؤرخ اپنا تحقیقی کام ہندوستان کے ماقبل کے یا معاصر برطانوی مؤرخین کی تعمیم سازیوں کے جائزے سے شروع کرتے ہیں۔

(viii) تقابلی تاریخ،سماجی علوم اور طبیعی یا جسمانی علوم (Physical Science) تعمیم سازیوں کے بیش بہا ماخذ ہیں۔ کوئی ان سے رہنمائی یا روشنی حاصل کر سکتا ہے۔چین یا انڈونیشیا یا الجیریا کی قومی تحریکوں کے مطالعات ایک نظیر کے طور پر ہمیں ہندوستان میں قومی تحریک سے متعلق تعمیم سازیاں کرنے کے اہل بنا سکتے ہیں۔تاہم دوسرے ممالک کا مطالعہ یا سماجی علوم وغیرہ کا اطلاق براہ راست یا ایک ایک کے تناظر میں نہیں ہو سکتا ۔یہ تمام امور ذہنی پس منظر کا کام کرتے ہیں۔یہ جانچ پرکھ کے لیے وسیع مفروضات فراہم کرتے ہیں اور ذاتی مواد کے لیے نئے رابطے،یہ اس قابل بناتے ہیں کہ کوئی اپنی تحقیق کے لیے تازہ شواہد تلاش کرے۔

(ix) اس کو عصر حاضر کی بہتر معلومات حاصل کرنا چاہیے،اسے عصر حاضر سے بہتر طور پر منسلک ہونا چاہیے،درحقیقت اسے حال کی تعمیر وتشکیل میں بھی حصہ لینا چاہیے۔زندوں کو سمجھنے کی صلاحیت یقیناً مردوں کو بہتر طور پر سمجھنے کا اہل بناتی ہے۔ایک عام نصیحت جو اکثر والدین اپنے بچوں کو کرتے ہیں،جو اس سیاق سے پوری مطابقت رکھتی ہے کہ تم ہمیں بہتر طور پر اس وقت ہی سمجھو گے جب تم خود کسی کے ماں باپ بن جاؤ گے۔درحقیقت ہم ماضی کے بارے میں تعمیم سازیوں کے لیے روزانہ حال سے کچھ نہ کچھ مستعار لیتے ہیں۔اس طرح ہمیں زندگی کے اس تجربے کی خصوصیت کو سنوارنا چاہیے جسے عقل عامہ (Common Sence) کہا جاتا ہے۔اکثر کمزور عقل عامہ کی صداقت (Truth) بہت زیادہ گمراہ کن ہوتی ہے۔اسی طرح کی عقل عامہ یا کمزور اصول متعارفہ کی عام مثالوں میں ایک ہے: کہ ایک سوال کے دو پہلو ہوتے ہیں۔یہ بات بہت سے معاملات میں بالکل صحیح نہیں ہے مثلاً دلتوں کا استحصال یا عورتوں کا استحصال یا تعصب پسندی یا نسل پسندی یا استعماری جبر واستبداد یا اسی طرح کے دوسرے معاملے۔

اگر کسی کے زندگی کے تجربے محدود ہوتے ہیں تو اس میں ماضی کے واقعات تحریکوں اور حتیٰ کے لوگوں کو بھی تنگ اور محدود زاویے سے دیکھنے کا رجحان ہوگا۔ مثال کے طور پر وہ سر بندرناتھ بنرجی یا دادا بھائی نیروجی یا گاندھی جی کے سامراجی مخالف ہونے کی وجوہات ذاتی محرومیوں کے تناظر میں سمجھے گا۔

اسی طرح وہ سیاسی طاقت کے معاملات اپنے خاندانی جھگڑوں کے تناظر میں سمجھے گا یا سیاسی نیک نامی کو ذاتی بے عزتی کے معنی میں، یا وہ حکومت کی پالیسی کو ذاتی احسان مندی یا انتقام یا جھگڑے کے روپ میں یا قومی بجٹ کو گھریلو رسوئی کے بجٹ کے معنی میں سمجھے گا۔

اسے انسانی وجود کو تمام رنگوں میں دیکھنے والی صلاحیت کی نشوونما کرنا چاہیے۔ لوگ مختلف سطحوں کے ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر وہ ایک سطح پر بہت ایماندار ہیں لیکن دوسری سطح پر بے ایمان ہو سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں میں یہ ایک غلط رجحان ہوتا ہے کہ وہ سیاسی تدبر کو ذاتی صالح زندگی سے متعلق کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی سیاسی رہنما اپنی ذاتی زندگی میں اعلیٰ انسان ہو لیکن سیاسی زندگی میں وہ بہت ظالم ہو۔ یا کوئی اپنی بیوی سے نہیں لڑتا ہو لیکن اپنے رفیق کاروں سے بہت جھگڑتا ہو یا اس کے برعکس۔ وکٹورین اخلاقی نقطۂ نظر اگلی نسل کے بہت سے ہندوستانی مؤرخین کے لیے گمراہ کن ثابت ہوا۔

اس طرح ایک مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل عامہ کی حدوں میں وسعت پیدا کرے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تمام زندگی مختلف قسم کے تجربات اور حرکت وعمل سے پُر ہو۔ حجرہ نشین زندگی ہمیشہ مؤرخ کی بصیرت کو محدود کرتی ہے۔ کوئی بھی انسانی زندگی کے مختلف قسم کے تجربات حاصل نہیں کرسکتا، خواہ وہ کتنی ہی سخت کوشش کرے، اس کے پاس زندگی کی مختلف النوع تفہیم کا ایک ہی راستہ ادب ہوتا ہے۔ ایک اچھے مؤرخ کو افسانہ، ناول اور ادب میں دلچسپی پیدا کرنا ہوتی ہے، یہاں تک کہ جاسوسی اور سائنسی فکشن میں بھی۔

میں اس پہلو پر گفتگو کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ زندگی کی تفہیم کی بہتر خاصیت بہتر تاریخ بناتی ہے، اور بہتر تاریخ بہتر زندگی بناتی ہے۔

(x) عام زندگی میں کسی کی حیثیت (Position) یقیناً اس کی تعمیم سازی اور تاریخ کی تفہیم کی صلاحیت کو متاثر کرتی ہے۔ کیا فرد متبدل ہے یا غیر متبدل ؟ اور اگر وہ متبدل ہے تو اس میں کس طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں؟ مثال کے طور پر کیا ایک فرد نسل اور ذات کے نظام میں عقیدہ رکھتا ہے؟ یا مرد کی فوقیت میں؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ زندگی میں فرد کے موقف سے اس کے تاریخیاتی موقف کا تعین ہوتا ہے لیکن اس کے اثرات کی ماہیت (Nature) اس بات سے طے ہوتی ہے کہ فرد کس حد تک اس مسئلے سے واقف یا باخبر ہے۔

Summary — 1.8 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے تعمیم سازی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ تعمیم سازی تاریخی تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے۔ حالانکہ تعمیم سازی پر بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ کوئی بھی تحریر عام اصطلاحوں اور تصورات کے استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ امور ماقبل کے کاموں سے برآمد ہوتے ہیں اور کیے جانے والے کام کے لیے نقطۂ آغاز ہوتے ہیں۔ تعمیم سازی کام کے ارتقاء کے طور پر تبدیلیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو، مؤرخین کو ہر سطح پر تعمیم سازیاں کرنا ہوتی ہیں جو انہیں حقائق اور مواد کے ماخذ کی تفہیم کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

Exercises — 1.9 مشقیں

1. تعمیم سازی کیا ہے؟ تعمیم سازی کی مختلف قسموں سے بحث کیجیے؟
2. کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تاریخ نویسی میں تعمیم سازی کی ضرورت ہے؟ تعمیم سازیوں پر ہونے والے اعتراضات سے بحث کیجیے؟
3. اپنے کام کو تعمیمیانے (Generalise) کی مختلف سطحیں کیا ہیں؟ وہ ماخذ کیا ہیں جن کی بنیاد پر عملی کام شروع کرنے سے پہلے آپ تعمیم سازی کرتے ہیں؟
4. اپنی تعمیمی صلاحیت کو آپ کیسے نکھار سکتے ہیں؟

NATIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY
Acc. No. MA-014A
Date 03.08.2015
HYDERABAD
IMC LIBRARY
Hyderabad

اکائی: 2 تعلیل — Causation

Structure — ساخت

2.1	تعارف	Introduction
2.2	علیت کیا ہے؟	What is Causality?
3.2	سماجی علوم اور تعلیل	Social Sciences and Causation
2.4	مؤرخین اور تعلیل	Historians and Causation
2.5	خلاصہ	Summary
2.6	مشقیں	Exercises
2.7	مجوزہ کتابیں	Suggested Readings

2.1 تعارف — Introduction

تمام سائنٹفک تحقیقات ایک سوال کیوں سے شروع ہوتی ہیں، پانی پر تیل کیوں تیرتا ہے؟ زلزلے کیوں آتے ہیں؟ قحط (Famines) کیوں پڑتے ہیں؟ جرمنی سے قبل برطانیہ میں کیوں صنعتی ترقی ہوئی؟ ہندوستان استعماری کیوں تھا؟ تمام منضبط علوم (Disciplines) کسی نہ کسی شکل میں سوال کیوں؟ کا جواب چاہتے ہیں۔ تاریخ بھی اس سے مستثنٰی نہیں ہے۔ دوسرے سماجی اور طبیعی (Natural) علوم کی طرح یہ بھی سوالیہ کیوں کا طرز تخاطب اپناتی ہے۔ خاص کر جب مؤرخین ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اس بات کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک خاص واقعہ یا مظہر کیوں واقع ہوا یا کیوں نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ رومی سلطنت کا زوال کیوں ہوا؟ پہلی جنگ عظیم کیوں ہوئی؟ برطانیہ نے اگست 1947ء کو ہندوستان کو حکومت کیوں سونپ دی؟ گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کیوں واپس لے لی؟ اس طرح تاریخ نویسی کیوں سے ابھرنے والے سوالوں سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم کئی دوسرے سماجی علوم کی طرح تاریخ کلیوں (Generalities) پر مرکوز (Focus) نہیں کرتی۔ یہ واقعات کی نوعی وضاحت وتشریح نہیں کرتی بلکہ ایک خاص وقوع (Occurrence) کا تجزیہ کرتی ہے۔ یہ تشریح ہی نہیں کرتی بلکہ اس بات کا جائزہ بھی لیتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام ختم کیوں ہوتا ہے؟ یا تہذیبوں کا تنزل کیوں ہوتا ہے؟ یا انقلابات کیوں آتے ہیں؟ 1947ء میں برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد کیوں کیا؟ مینن (Minoan) آبادی برباد کیوں ہوئی؟ سوشلسٹ انقلاب روس میں سب سے پہلے کیوں آیا؟ دوسرے الفاظ میں مؤرخین خاص واقعات کی توجیہ کرتے ہیں۔ تاریخ واقعے کو ایک عام نوع کی مثال کے طور پر لینے کے بجائے اس کا اس کے لحاظ سے ادراک کرتی ہے، پیٹرک گارڈنیر (Patrick Gardiner) کی زبان میں ایک بے نظیر کوائف کے طور پر۔ مجموعی طور پر یہ ان ابعاد پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے جو موجودہ واقعے میں خاص ہوتے ہیں اور ثبوت پیش کرتے ہوئے پوری وضاحت کرتی ہے کہ فلاں واقعے کیوں ہوا اور کب ہوا؟

2.2 علیت کیا ہے — What is Causality

حالانکہ واقعے کو ایک بے نظیر کوائف کے طور پر سمجھا جاتا ہے تاہم مؤرخین اس کے واقع ہونے کی توجیہ کرتے ہیں۔ ایک واقعے کا بطور خاص کوائف کے تجزیہ پیش کی گئی وضاحتوں کی تاثیریت یا اس کے صداقت (Truth) کو پیش کرنے کے دعوے کو ضرر نہیں پہنچاتا ہے۔ دوسرے سماجی علوم کے ماہرین کی طرح، مؤرخین زیر غور مظہر کی مکمل وضاحت کرتے ہیں اور وہ اس کام کے لیے واقعے کے وقوع ہونے کی علت کا تعین کرتے ہیں۔ اس طرح علتوں کی تلاش وجستجو تاریخی تجزیہ میں مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ ابتدا سے 18 ویں صدی تک فلسفیوں اور مؤرخین کا عام طور پر اس بات پر یقین تھا کہ ایک واقعے

کے ماقبل علت لازمی طور پر ہوگی۔ یعنی وہ جو واقعے سے پہلے واقع ہواسی کی وضاحت۔ اور یہ کہ ماقبل واقعہ لازماً باضابطہ طور پر اثر سے منسلک ہوگا۔ تاہم جان ایس مل (Johan S.Mill) کے مطابق علت کی اس وقت تک شناخت نہیں ہوتی جب تک کہ ایک واقعہ پہلے نہ ہو جائے۔ کسی قدر یہ ایک شرط (Condition) یا ایک شرطوں کے مجموعے کے طور پر قیاس کی جاتی ہے جو ہمیشہ موجود ہوتی ہے جب E واقعہ ہوتا ہے اور ہمیشہ غیر موجود جب E واقعہ نہیں ہوتا۔

دوسرے الفاظ میں علت ایک ایسی شرط (Condition) ہے جو دیے ہوئے واقعے E کو ظاہر کرنے کے لیے ضروری بھی ہے اور حسب ضرورت (Sufficient) بھی۔ اس کو ضروری اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی عدم موجودگی E کے اثر کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی ہے اور یہ حسب ضرورت اس لیے ہے کہ اس کی موجودگی دیے ہوئے نتیجے E کو پیدا کرتی ہے۔ اگر ایک مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ افراد جن میں وٹامن اے کی کمی تھی، کورشی (Night Blindness) کے مرض میں مبتلا تھے اور وہ لوگ جن میں وٹامن اے حسب ضرورت مقدار میں تھا انہیں یہ مرض نہیں تھا تو اسی طرح تمام باتوں کو دیکھ کر، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وٹامن A کی کمی کورشی کی علت ہے۔ ہم یہ تفویض کر سکتے ہیں کہ A علت ہے کیوں کہ اس کی عدم موجودگی کا مطلب تھا کورشی اور اس کی موجودگی کا مطلب تھا اثر (effect) کی عدم موجودگی یعنی کورشی کا نہ ہونا۔

یہاں تین نکات پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ پہلا یہ کہ ضرورت کی نسبت (Relationship) بامعنی طور پر اس کی حسب ضرورت فراہمی (Sufficiency) سے مختلف ہے۔ دوسرا یہ کہ علت کو ایک شرط کے طور پر سمجھا جاتا ہے جو ضروری بھی ہے اور حسب ضرورت بھی اور تیسرا یہ کہ مستقل عطف (Constant Conjunction) ایک علّی نسبت (Causal Relationship) کا ایک معقول اشارہ نہیں ہے۔ اگر ایک موجود مثال میں بندش قلب (Cardiac arrest) سے ایک فرد کی موت ہو جاتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرکت قلب کا بند ہو جانا ایک شرط تھی جو اثر کو پیش کرنے کے لیے حسب ضرورت تھی جسے ایک فرد کی موت کہا جاتا ہے۔ تاہم یہ دعویٰ کرنا کہ بندش قلب ایک فرد کی موت کی ضروری شرط (Condition) ہے تو ہمیں یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ بندش قلب کے نہ ہونے کا مطلب اثر کی عدم موجودگی ہوگی یعنی موت نہ ہونا۔ اگر موت کی وجہ کوئی دوسری شرط ہو جیسے جگر کی خرابی یا دماغ کی نس پھٹ جانا تب بندش قلب کے ایک حسب ضرورت شرط ہونے کے امکان ہیں لیکن اس کو واقعے کے وقوع یعنی فرد کی موت کے لیے ضروری شرط کے طور پر تفویض نہیں کیا جاسکتا۔ جب ایک فرد کی دوسری شرطوں کے موجود ہونے کی وجہ سے موت ہو سکتی ہے تو بندش قلب کی عدم موجودگی اثر کے لیے مانع نہیں ہوگی۔ لہٰذا زیر غور واقعے کی یہ ایسی شرط نہیں ہو سکتی جو ضروری ہو۔ یہاں جو کچھ سمجھایا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ ضرورت کی نسبت اس کے حسب ضرورت ہونے سے مختلف ہے اور علوم کے فلسفوں میں علت کو ایک ضروری اور ایک حسب ضرورت شرط کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

اگر علت ایک ضروری اور حسب ضرورت شرط ہے تو یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ باضابطہ طور پر موجودہ اثر سے جڑی ہوئی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہمیشہ موجود ہوگی جب اثر واقع ہوتا ہے اور یہ ہمیشہ غیر موجود ہوتی ہے جب اثر E نہیں ہوتا۔ مستقل عطف (Constant Conjunction) اس طرح علت کی ایک قابل مشاہدہ خصوصیت ہے۔ مزید یہ کہ شرط علی (Causal Condition) ہمیشہ اثر کے ماقبل ہوتی ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شرط جس کا واقعے E کے ماقبل کے طور پر مسلسل مشاہدہ کیا جاتا ہے، بعد کے واقعے کی علت قرار پائے۔ مستقل عطف (Constant Conjuction) اور مکانی اتصال (Spatial Congtiguity) ایک علت و معلول (Cause.Effect) کے انسلاک کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن علت کی شناخت صرف اسی بنیاد پر نہیں کی جاسکتی۔ ایک میوزک ریکارڈ میں گانے ایک مخصوص ترتیب سے بجتے ہیں تاہم وہ گانا جو پہلے بجتا ہے بعد میں بجنے والے گانے کی علت نہیں ہوتا۔ اسی طرح برق باضابطہ طور پر کڑک سے پہلے دکھائی دیتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بعد میں ہونے والے واقعے کی علت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بجلی اور کڑک دونوں باہم مختلف علتوں کے مرئی اثرات ہوں۔ یہاں ضرورت ہے کہ یہ نمایاں کیا جائے کہ باضابطہ طور پر انسلاک (Regular Association) اپنے آپ میں اس دعوے کے لیے کافی وشافی نہیں ہے کہ جس شرط کا پہلے مشاہدہ کیا جاتا ہے وہ بعد کے واقعے کی علت ہے۔ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک واقعے کی کچھ نہ کچھ علت ہوتی ہے، ہمیں یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی عدم موجودگی بیان کیے جانے والے واقعے کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔

اسی طرح واقعات کی صحیح ترتیبی نظام میں فہرست سازی کسی واقع کی تشریح و وضاحت فراہم نہیں کرتی۔ ہم ایک صحیح زمانی ترتیب میں تمام واقعات کو مرتب کر

سکتے ہیں کہ فلاں واقعہ فلاں دن ہوا لیکن اس سے اس بات کی توجیہ نہیں ہوتی کہ واقعہ E کیوں واقع ہوا۔ مثال کے طور پر واقعات کی سادہ فہرست سازی جو ایک کے بعد ایک ہوئے ہوں ہمیں یہ اشارہ نہیں کرسکتی کہ متعلقہ فرد حادثہ کا شکار کیوں ہوا یا وہ بیمار کیوں ہوا۔ ہمیں یہ پتہ چلنا چاہیے کہ ایک خاص واقعہ کیسے ہوا۔ حادثے کے وقت ہونے والی چیزوں کی صحیح ترتیب اس بات کی توجیہ نہیں کرسکتی کہ حادثہ کیوں ہوا یا ایک شخص شدید طور پر زخمی ہوا۔ اسی طرح مؤرخین زمانی ترتیب میں جنوری 1947ء سے اگست 1947ء تک کے واقعات کو رکھ سکتے ہیں لیکن ان سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوگی کہ 1947ء میں برطانیہ نے ہندوستان کو کیوں چھوڑ دیا۔ یہ الفاظ دگر توجیہ یا کیوں سے پیدا ہونے والے سوال کے جواب کے لیے واقعات کو ایک کے بعد ایک صحیح ترتیب میں رکھنے کے مقابلے میں کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کم سے کم ہمیں یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک خاص شرط کی موجودگی جو پہلے ہے اسی نے اثر کو پیدا کیا ہے اور اس شرط کی عدم موجودگی کے معنی واقعے کا نہ ہونا ہے۔ مختصر یہ کہ علت کی شناخت کا معاملہ چیزوں کو ایک کے بعد ایک ترتیب دینے سے جدا ہے۔ یہاں ضرورت ہوتی ہے وہ شرط متعین کرنے کی جو ضروری تھی یعنی ایسی شرط جس کے بغیر واقعہ نہ ہوسکے۔

2.3 سماجی علوم اور تعلیل Social scinces and Causation

طبیعی علوم (Natural Sciences) کے محققین ضروری اور حسب ضرورت شرائط کو متعین کرنے کے لیے کنٹرول اختیارات (Controlled experiments) کا استعمال کرتے ہیں۔ کنٹرول اور حکمت عملی سے کام لیکر وہ ایک ایسی شرط جس کا اطلاق ایک نوع کی تمام چیزوں پر ہوتا ہے، کا تعین کرتے ہیں جو اثر (Effect) کی حامل ہوتی ہے۔ اگر C شرط کو حذف کیا جائے تو اس کا نتیجہ E کی عدم موجودگی ہوتا ہے اور یہ امر تمام چیزوں میں یکساں ہوتا ہے تو C کو E کی علت قرار دیا جاتا ہے۔ سماجی علوم میں کنٹرول شرائط کے تحت اختیارات (Experiments) کا استعمال ہمیشہ ممکن یا حسب منشا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک خاص علاقہ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی علت کا تجزیہ کررہے ہیں تو اس کے لیے کنٹرول اختیارات کا استعمال ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ واقعہ جس کی توجیہ کی جارہی ہے پہلے ہی ہوچکا ہے اس میں اختیارات اپنی فطری ترتیب (Natural Setting) میں نہیں کیے جاسکتے۔ ان اختیارات کا صرف مصنوعی یا لباریٹری صورت حال (Condition) میں اعادہ کیا جاسکتا ہے۔ جس پر دراصل یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا ہم وہی صورت حال پیش کررہے ہیں جس میں افراد ایک دوسرے سے دست وگریبان ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ قطعی طور پر افراد کے ان گروہوں کی تحقیق بہت مشکل ہے جن کا رویہ اس امر کی ہو بہو نقل ہو۔ ان تمام زیر غور امور میں کنٹرول اختیار کا التزام سماجی علوم میں لاتعداد مسائل کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ان علوم کے محققین ایک علی توجیہ کے لیے اس طریقہ کار (Technique) پر بھروسہ نہیں کرتے۔

سماجی علوم کے محققین ان طریقوں کے ذریعے علتوں کی شناخت کرتے ہیں جنہیں جان اسٹارٹ مل نے توافقی طریقہ کار (Method of Agreement) اور غیر توافقی (Disagreement) یا تخالفی طریقہ کار (Difference) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ توافقی طریقہ کار کے تحت ان حالات یا شرائط کی تفصیلی فہرست تیار کی جاتی ہے جو واقعہ E کے وقوع ہونے کے وقت موجود تھیں۔ دوسری طرف تخالفی طریقہ کار میں اس صورت حال کی اس لحاظ سے تحقیق کی جاتی ہے جس میں ماقبل کے حالات اور مظہر مختلف ہوں۔ یہی وہ صورت حال یا شرط ہے جس کی غیر موجودگی اس واقعے کی عدم موجودگی کی ترجمانی ہے۔ سماجی علوم کے محقق E واقعے کی علت کے تعین کے لیے انہی دونوں طریقہ کاروں کو مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ مثبت اور منفی دونوں مثالوں کے ذریعہ قطعیت کے ساتھ علت کی نشاندہی کرتے ہیں یعنی واقعے E کے ہونے کی مثالیں اور واقعے E کے نہ ہونے کا محل وقوع (Situations)۔ اگر تمام صورتوں میں وقوعے E کے ہونے میں شرط C ہمیشہ موجود تھی اور ان تمام صورتوں میں جہاں شرط C نہیں تھی E واقع نہیں ہوا تو C واقعے E کی علت تسلیم کی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان تمام مثالوں میں جہاں اندرونی گروہ بندی (Factionalism) موجود تھی کانگریس کو انتخاب میں شکست ہوئی اور ان تمام صوبوں میں جہاں وہ گروہ بندانہ سیاست سے آزاد تھی، اسے رائے دہندگان کی بھرپور حمایت حاصل رہی، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اندرونی گروہ بندی پارٹی کی شکست کی علت تھی۔ یہاں علی شرط متخالف معاملوں کے مطالعے کی بعد شناخت میں آئی۔ یعنی وہ سیاق جس میں کانگریس کو فتح حاصل ہوئی اور وہ صوبے جن میں اسے شکست ہوئی۔ یہاں یہ بات مان لی گئی کہ وہ صوبے صرف ایک پہلو سے باہمی طور پر مختلف تھے جبکہ ان میں دوسری

شرائط یکساں تھیں۔ مثال کے طور پر اگر گروہ بندی وہاں پائی جاتی ہے جہاں کانگریس یکے بعد دیگرے انتخابات میں پہلے سے ہارتی رہی ہے یا جہاں مخالف پارٹیوں کے ووٹوں کی تعداد میں کئی سالوں سے بڑھوتری ہو رہی ہے تو گروہ بندی کو اس شکست کی علت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی فتح دیہی آبادی پر توجہ مرکوز کرنے کی وجہ سے عمل میں آئی ہو۔ اور اس بات کے کچھ پہلے سے شواہد موجود ہوں کہ ان طبقوں نے ماضی میں بھی کانگریس کی حمایت کی تھی تو یہ نتیجہ آسانی سے اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ گروہ بندی اس فتح کی علت ہے۔ اور اگر وہ صوبے جہاں اسے شکست ہوئی وہی تھے جہاں فرقہ وارانہ تشدد کے وافر ثبوت موجود ہیں تو پھر ان دو قسم کے صوبوں میں ابتدائی شرائط کی عدم موجودگی گروہ بندی کو علی شرط قرار دینے کی راہ میں مانع ہوگی۔ ایک مشترکہ شرط ''پارٹی کی اندرونی گروہ بندی'' کی موجودگی ان صوبوں میں جہاں وہ انتخابات ہاری اور ان صوبوں میں اس کی عدم موجودگی جہاں اسے فتح حاصل ہوئی، اس دعویٰ کے لیے اپنے آپ میں ناکافی ہے کہ گروہ بندی عوامی مخالفت کی علت ہے۔ ممکن ہے انتخابات میں شکست و فتح مکمل طور پر مختلف علی شرائط کی وجہ سے عمل میں آئی ہو۔ لہٰذا نتیجہ خیز عامل یہ ہے کہ تقابل کیے جانے والے حالات میں تمام دوسری شرائط لازمی طور پر حسب معمول (atpar) ہوں گی۔ اگر تقابل کیے جانے والے معاملات کئی پہلوؤں سے مختلف ہیں تو کسی بھی سطح کے یقین کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں کہ علی شرط کیا ہے۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ سماجی علوم میں علت کی شناخت بہت سے حالات یا محل وقوع کے مطالعے کے ذریعے کی جاتی ہے جو اپنی ماقبل شرطوں کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں لیکن نتیجہ یا مظہر جو واقع ہوتا ہے اس میں مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم تقابلی سیاق کے نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتا ہے؟ اس وقت کیا ہوتا ہے جب ہم یکساں واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی توجیہ بے مثال واقعے کے طور پر کرتے ہیں؟ اس وقت ہم علت کی شناخت کیسے کرتے ہیں؟ ایسی صورت میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام معاملات میں علی شرط کی شناخت کے لیے کوئی اطمینان بخش راستہ نہیں ہے۔ دراصل بہت سے فلسفیوں سے معروض (Object) کی امتیازی خصوصیت اور تاریخ میں تحقیق کے مقاصد کی وجہ سے یہ استدلال کیا کہ ہم علتوں کی تحقیق سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ طبیعی علوم کو وہ تعمیمی علوم کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اصولوں جیسی تعمیموں کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تاریخ تجزیہ کیے جانے والے معاملے میں عدیم المثل چیز پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ مزید یہ کہ طبیعی علوم تکنیکی کنٹرول میں اضافے کے پیش نظر حصول علم کے جویا ہوتے ہیں۔ علتوں کی تلاش و جستجو نہ صرف اس توجیہ کے لیے ہوتی ہے کہ کوئی چیز کیوں ہوئی بلکہ یہ ان حالات کی پیش گوئی کے لیے بھی ہوتی ہے جن میں ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ ویسے ہی واقعات وقوع پذیر ہوں گے اور ان پر کیسے قابو پایا جائے۔ کس حکمت عملی سے کام لیا جائے یا ان کو کیسے بدلا جائے کہ وہ دوبارہ نہ ہوں۔ دوسری طرف تاریخ اس بات کو سمجھنے کے لیے تلاش و جستجو کرتی ہے کہ ایک وقوعہ کیوں ہوا۔ یہ دیے ہوئے تعریف شدہ تاریخی سیاق جس میں وہ واقع ہوا تھا اس کے معنی کی نشاندہی کر کے ایک مظہر کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ چونکہ اس کا مقصد ترسیل وابلاغ اور تعامل میں اضافہ کرنا ہوتا ہے، یہ ایک مختلف قسم کے علمی ذوق میں جذب ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ ایک مختلف طریقہ جاتی شناخت رخ (Methodological orientation) پر انحصار کرتی ہے۔ ان علتوں کی صورت حال یا شرط کو شناخت کرنے کی جگہ یا موجود اثر کو پیش کرنے کے بجائے یہ اس کے ساتھ خاص تصور عالم (world-view) کے مظہرہ (Expression) کے طور پر سلوک کر کے واقعے کی تفہیم کرتی ہے۔ بہ الفاظ دگر موجود وقوعے کی وضاحت کرنے سے زیادہ یہ زندگی، اظہار (Expression) اور ایک تاریخی عالم گیر سیاست (Weltanschaung) کے درمیان ربط (link) تلاش کرتی ہے اور اس کی تفہیم کرتی ہے۔

یہاں اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ایک وقوع کی علت کا تعین جو کہ عدیم المثل ہے یا پہلی بار واقع ہوا ہے ایک سنجیدہ چیلنج کا حامل ہوتا ہے۔ وہ مؤرخین جو تحقیق کی علی ہیئت کی اہمیت اور مناسبت کی توثیق کرتے ہیں انہوں نے علت کے تصور کی تعریف نو کر کے اس چیلنج کا سامنا کیا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے توجیہ (Explanation) کو پیش گوئی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ استدلال کیا ہے کہ علت ایک شرط کا حوالہ ہوتی ہے، جس نے دیے ہوئے محل وقوع (Situation) میں نتیجہ خیز تبدیلی پیدا کی ہے۔ حالانکہ علت پہلے ہی سے اس دعویٰ (Assertion) کے ساتھ منسلک تھی کہ C تھا تو E تھا ان کا ادعا ہے کہ شناخت کی گئی علت C تمام E قسم کے واقعات کی توجیہ کرنے کے بجائے دیے ہوئے واقعے E کی ہی توجیہ کرتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علت مکمل طور پر یہ واضح کرتی ہے کہ خاص وقوعہ دیے ہوئے زمان اور مکان میں کیوں وقوع پذیر ہوا۔ ان کی رائے ہے کہ مؤرخین ایک صورت حال یا شرط کی تلاش و جستجو کرتے ہیں جو ان حالات کے تحت ضروری تھی۔ ان کے اس عمل کو واحد علی ادعا (Causal assertions) کہا جا سکتا ہے۔

Historians and Causation   2.4 مؤرخین اور تعلیل

واحد علی ادعا پیش کر کے مؤرخین توجیہات کو پیش گوئیوں (Predictions) سے علیحدہ کرتے ہیں۔ان کا استدلال ہے کہ ایک مکمل توجیہ صحیح پیش گوئیوں سے مشروط نہیں ہوتی۔ درحقیقت تاریخ کے کئی فلسفیوں نے اس کو استقامت بخشی ہے کہ توجیہ اور پیش گوئی دو مختلف قسم کے عمل ہیں جو مختلف قسم کے ثبوتوں اور تصدیقات میں شامل ہوتے ہیں۔ پیش گوئی میں بھی باضابطگی اور ترتیب کی تکرار فرض کی جاتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کل سورج پورب سے نکلے گا اور اگلے دن بھی۔ یہ ہم اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ کائنات کی ساخت اور وہ اصول جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے تبدیل نہیں ہوں گے۔ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ پیٹرن اور باضابطگی جس کا آج مشاہدہ کیا گیا ہے کل بھی رہینگے جو ہمیں مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔تاہم یہ مفروضہ علی رابطوں (Connections) کی صراحت کے لیے غیر مناسب (Irrelevant) ہے۔ہم معقول درستگی کے ساتھ E کے وقوع ہونے کی علت کا تعین کر سکتے ہیں جب کہ E پہلی بار واقع ہوا ہے یا وہ ایک عدیم المثل کوائف (Unique particular) ہے۔ پیش مفروضے (Presupposition) کے نہ ہونے کی صورت میں وہ سماجی حقیقت غیر متغیر رہے گی اور موجودہ پیٹرن وہی ہوں گے، ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ جب کبھی C واقع ہوگا اسی کے مطابق E ہوگا۔

یہاں توجیہ اور پیش گوئی کے درمیان فرق و امتیاز قائم کیا گیا ہے۔ سائنس کے تجربی نظریہ (Empircist Theories) کے مطابق توجیہ (Eplanation) اور پیش گوئی (Prediction) لاینحل طور پر ایک دوسرے سے مربوط (Inked) ہوتے ہیں۔یعنی ایک کو دوسرے کی شرط تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ C وقوعے E کی علت (ضروری اور حسب ضرورت) ہے تو یکساں طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب بھی C موجود ہوگا اس کے بعد E لازمی طور پر ہوگا۔اور معکوسی طور پر ایک کامیاب پیش گوئی بے کم و کاست توجیہ کا ایک اشاریہ مانی جاتی ہے۔اس طرح توجیہ اور پیش گوئی ایک سکے کے دو پہلوؤں کے طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ خصوصاً تاریخ میں توجیہ اور پیش گوئی کے درمیان اس مجوزہ ربط پر سوالیہ نشان قائم کیا جاتا ہے۔اس کے بجائے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ علی تحقیق اور توجیہ پیش گوئی کے عمل سے ممیّز و ممتاز ہیں۔ایک مکمل توجیہ پیش گوئی کا پیش خیمہ نہیں ہوتی۔اس کے برعکس کامیاب پیش گوئی پیش کی گئی توجیہ کی صداقت یا درستگی کا اشاریہ نہیں ہوتی۔ ہم آسمان پر کالے بادل دیکھ کر بے کم و کاست یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ اگلے بارہ گھنٹوں میں بارش ہوگی۔ لیکن یہاں ایک کامیاب پیش گوئی اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کرتی کہ یہ واقعہ کیوں ہوگا۔اسی طرح ایک بچے کے چہرے پر لال دھبے دیکھ کر ہم صحیح طور پر پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ کھسرا کے مرض سے دوچار ہے۔لیکن ایک بار پھر یہ صحیح پیش گوئی اس حقیقت کا اشارہ فراہم نہیں کرتی جس سے ہمیں اس کے وقوع ہونے کی کوئی وجہ معلوم ہو۔اس طرح پیش گوئی کا عمل توجیہ کے عمل سے مختلف ٹھہرتا ہے۔ ممکن ہے کہ مؤرخین پیش گوئی نہ کر سکیں لیکن وہ باوجود اس کے، ایک واقعہ کی مکمل توجیہ و وضاحت کرتے ہیں کہ وہ خاص واقعہ کیوں ہوا۔

پیش گوئی سے توجیہ کو علیحدہ کر کے مورخین نہ صرف توجیہ سے ''عام قانونی ماڈل'' جسے اثباتیت پسند استعمال کرتے ہیں، کو چیلنج کرتے ہیں بلکہ علت کے تصور کی تعریف نو بھی کرتے ہیں۔ وہ علت کو ضروری اور حسب ضرورت شرط کے طور پر قبول کرنے کی جگہ اس شرط یا صورت حال کی تفہیم کرتے ہیں جو ان حالات (Circumstances) میں ضروری ہے۔علی شرط کو بطور واحد نمایاں کرنے کی ضرورت پر جو ان حالات میں ضروری ہے انکشاف حقیقت (realisation) مزید زور دیتی ہے کہ بہت سے تاریخی واقعات حد سے زیادہ متعین ہوتے ہیں یعنی یہ کہ وہ ایک سے زیادہ علی شرط کی موجودگی سے متصف ہیں۔ جب ان میں سے ہر ایک شرط آزادانہ طور پر اسی نتیجے کی حامل ہو سکتی تھی تو تجزیہ نگار کسی ایک کی تخصیص نہیں کر سکتا جو قطعی طور پر ضروری تھی۔ کل ملا کر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان حالات میں ضروری تھی۔

آیئے اس مسئلے پر ایک مثال کی مدد سے مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر ہمیں معلوم ہے کہ ایک بپھری ہوئی بھیڑ آگ لگانے کے ارادے سے اسمبلی حال کی طرف بڑھتی ہے تقریباً اسی وقت اس عمارت پر بجلی گرتی ہے اور اس طرح حال میں آگ لگ جاتی ہے۔تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے حال میں آگ لگنے کی ضروری اور حسب ضرورت شرط کون سی تھی۔ اسمبلی حال متشدد بھیڑ کی وجہ سے بھی جل سکتا ہے اور بجلی گرنے سے بھی۔ اگر بھیڑ کا اس طرح کا مقصد نہیں ہوتا تو حال میں برق کی وجہ سے ہی آگ لگتی یا اس کے برعکس۔ اگر برق عمارت پر نہیں گری تو لوٹ مار کرنے والی بھیڑ کی وجہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔اس طرح ایک

شرط کی عدم موجودگی کا مطلب اثر کی عدم موموجودگی نہیں ہوتا یعنی حال میں آگ لگنا۔ اس نوع کی صورت حال میں دو یا زائد شرطوں کی تخصیص ہے جن میں سے ہر ایک اسی نتیجے کی حامل ہوسکتی تھی۔ ہم ضروری لمحے کی شناخت نہیں کر سکتے۔ کل ملا کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے کونسی شرط حائل ہوئی۔ اگر برق ہیٹر کے عمل شروع کرنے سے پہلے گری تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ شرط تھی جو ان حالات میں ضروری تھی۔

محل وقوع (Situation) جن کا مؤرخین تجزیہ کرتے ہیں ایک ہی قسم کے سمجھے جاتے ہیں۔ عدیم المثل اور حد سے زیادہ متعین شدہ (Over Ditermind) ہونے کے لیے محققین آخری حد تک اس شرط کی شناخت کی کوشش کرتے ہیں جو ان حالات میں ضروری تھی۔ مثال کے طور استعماری کے بیچ کنی کے عمل کی موجودہ فہم اور موجودہ دستاویزات کے سروے کی بنیاد پر مؤرخین اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ حکومت کے خلاف عوامی اظہار ساتھ ہی ادائیگی کے ناموافق توازن نے استعماری قوتوں کو ہندوستان پر حکومت قائم رکھنے کے لیے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس خطے میں برطانوی فوج اور اس کی حکمت عملیوں سے متعلق مفادات کے احتساب نے ہندوستان کو طاقت منتقل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ جب ان میں سے ہر شرط ایک ہی جہت میں عمل پیرا تھی تو ہندوستان سے برطانیہ کے انخلا کی علت کیا ہوسکتی تھی اور خصوصاً 1947ء اگست کو اس انخلا کی کیا وجہ تھی۔ مؤرخین اس سوال کا جواب اس ایک شرط کی نشاندہی کر کے تلاش کرتے ہیں جو ایک دیے ہوئے بحران (conjuncture) میں معنی خیز تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ موجود دستاویزی ثبوت ان شرائط کے احتساب کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جس کو برطانیہ نے بطور خاص ایک فریق کے ان شرائط میں سے قبول کیا اور جس نے ایک قسم کا دباؤ بنایا جس کی وجہ سے استعماری نظم و نسق قائم رکھنے میں حد درجہ مشکل پیدا ہوگئی اگر چہ اس مقام پر ایسا نہ بھی ہو۔

علی شرط کی شناخت کے لیے جو کچھ ان حالات کے تحت ضروری تھی، ثبوت اسی معاملے سے مہیا کیا جاتا ہے۔ پہلے مماثل محل وقوعوں (situations) سے تقابل کیا جاتا اور ادراکات اور مختلف عاملوں کے افعال، مختلف شرطوں کی اضافی معنویت کے احتساب کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس طرح معروضی شرطیں اور موضوعی وجوہات موجود فیصلہ کن تبدیلی کے سبب کے تعین کے لیے آپس میں باہم گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ چونکہ بہت سے تاریخی تجزیہ مقاصد اور عاملوں (agents) کے افعال کو استعمال کرتے ہیں ساتھ ہی خارجی شرطوں کے تفاعل کو، اس لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مؤرخین ایک دیے ہوئے واقع یا مظہر کی توجیہ و وضاحت اس کے وقوع ہونے کے سبب کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ یعنی وہ سوالیہ کیوں کا جواب کیا ہوا اور کیسے ہوا کے تجزیہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس ذیل میں دو نکات یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ پہلا یہ ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ واقعات کو سلسلے وار ترتیب میں رکھنے سے ایک واقع کی توجیہ نہیں ہوتی۔ ایک کہانی ابتداء، وسط اور اختتامی امور کے ساتھ کہنا کبھی کافی نہیں ہوتا کم سے کم مؤرخین کو خارجی مادی ساخت کی ترتیب اجزاء (Configuration) کو دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اندر خاص فعل تصور کیے جاتے ہیں اور عمل میں آتے ہیں۔ اور جس کے اندر وہ ایک خاص نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ دوسرا جو بہت اہمیت کا حامل ہے یہ کہ تمام ممکنہ شرائط کی ہمہ جہتی وضاحت اور افعال (Actions) کی حد ایک علی توجیہ قائم نہیں کرتی۔ اس امر کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک ایسی شرط کا تعین کریں جو کم سے کم ان حالات کے تحت ضروری تھی۔

ایک کہانی کہنے اور تاریخی واقع کے عملی تجزیہ میں فرق یہ ہے کہ بعد کا عمل پہلے عمل کے برعکس اس بات پر توجہ مرکوز کرتا ہے کہ نتیجہ خیز تبدیلی کا سبب کیا تھا۔ یہ صرف ان مختلف لمحوں کو باہم مربوط نہیں کرتا جو شعور پیدا کرتے ہیں بلکہ یہ ان سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ یہ اس شرط کو دریافت کرتا ہے جس کی عدم موجودگی میں واقعہ نہ ہوا ہو اور اس کی موجودگی میں ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ ضروری لمحے کا تعین کرتا ہے۔ یہ ضروری لمحہ ایک واحد شرط یا شرطوں کے پیچیدہ مجموعے کا حصہ ہوسکتا ہے۔ 1947ء میں ہندوستان کو طاقت کی منتقلی کے معاملے کے تجزیہ میں ممکن ہے کہ ایک مؤرخ یہ دلیل پیش کرے کہ بحری فوجی بغاوت نے یہ نتیجہ خیز تبدیلی پیدا کی۔ یعنی یہ علی شرط تھی۔ اس ضروری لمحہ کی عدم موجودگی سے اس وقت طاقت کی منتقلی نہ ہوتی۔ یکے بعد دیگرے یہ مؤرخ یہ استدلال پیش کرے کہ فوجی بغاوت عوامی مہم کے لیے ضروری لمحہ تھی اور انہوں نے مشترکہ طور پر جو نتیجہ پیش کیا وہ طاقت کی منتقلی تھا۔

جب مؤرخین بعد کی روش کی تصدیق کرتے ہیں تو وہ علت کی (INUS) کے طور پر تعریف کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں علت تسلیم کی جاتی ہے ایک شرط یا صورت کا ہونا جو حسب ضرورت نہیں (Insufficiant) لیکن شرطوں کے مجموعہ کے لیے ضروری لمحہ ہے، جو غیر ضروری ہے لیکن جو دیے ہوئے واقعے کو پیش کرنے کے لیے حسب ضرورت ہے۔ آیئے اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ بحریہ ریٹنگس میں شر و فساد کو ایک علت کے طور پر دریافت کر کے وہ مؤرخ یہ بتا رہا ہے کہ اسی صورت حال یا شرط نے نتیجہ خیز تبدیلی پیدا کی۔ اگر یہ خلل و فساد نہ ہوا ہوتا تو اگست 1947ء میں طاقت کی منتقلی نہیں ہوتی۔

مزید یہ کہ بحریہ ریٹنگس میں ہنگامے نے دوسرے مشہور دعاوی جیسے ''بھارت چھوڑو تحریک'' اور باغی کسانوں کے ساتھ مل کر اس اثر (Effect) کو پیدا کیا ۔اجتماعی طور پر انہوں نے چھوٹی سی حسب ضرورت شرط کے الجھاؤ کو پیدا کیا اور اس الجھاؤ میں بحریہ فوجی بغاوت ضروری لمحہ تھی ۔ تاہم شرطوں کا یہ الجھاؤ (Complex of Condition) واقعے (طاقت کی منتقلی) کے لیے ضروری نہیں ہوسکتا ۔ اگر یہ شرط کامیاب نہیں ہوتی تو ادائیگی کا ناموافق توازن یا کلیدی مفادات کے آنکڑے بھی برطانیہ کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کرتے گو کہ یہ عمل اگست 1947ء میں نہیں ہوتا ۔ نتیجتاً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مشہور محرکات کا ایک ایسا الجھاؤ نہیں ہوسکتا جو مطلق طور پر ضروری ہو ۔ ہم سب یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں موجودہ حالات کے تحت یہ اس نتیجے کو ظاہر کرنے کے لیے حسب ضرورت تھا ۔ اس ذیل میں بغاوت شرطوں کے الجھاؤ کے لیے ایک ایسا لمحہ ضروری تھی جو مجموعی طور پر غیر ضروری تھیں ۔ یہ واقعہ شرائط کے دیگر مجموعے کے وسیلے سے بھی پیش آسکتا تھا لیکن اس وقت بغاوت دیگر عام محرکات کے ساتھ اس نتیجے کے لیے حسب ضرورت یا کافی تھی جسے ہندوستان کو طاقت کی منتقلی کہا جاتا ہے ۔

یہاں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ مؤرخین علت کے تصور کی تعریف نو کرتے ہیں ۔ یہ علت کو ضروری یا حسب ضرورت شرط کے طور پر برتنے کے بجائے ایک INUS شرط یا ان حالات کے تحت ضروری شرط کے بطور قبول کرتے ہیں ۔ علت کے تصور کو اس ہیئت میں متصور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس واقعے کی وضاحت کرتے ہیں اسے ایک عدیم المثل واقعے کے طور لیا جاتا ہے، جو ان حالات کے توافق سے پیدا ہوا جو اس سیاق سے مختص ہے ۔ اور سیاق ان کئی شرطوں کی موجودگی سے مشخص ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک شرط وہی نتیجہ پیش کرسکتی ہے چاہے وہ یکساں طرز اور یکساں وقت میں نہ ہو ۔ تاہم علت کی یہ تعریف نو چھان بین کی توجیہی قوت کو متاثر نہیں کرتی ۔ دوسرے الفاظ میں، حالانکہ علی شرط صرف حالات کے تحت ضروری شرط دکھائی دیتی ہے یا دوسری شرطوں کے ساتھ ملی ہوئی لیکن پھر بھی یہ اس بات کی پوری وضاحت کرتی ہے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا ۔ یہ ہمیں یکساں حالات میں یکساں واقعے کی یقین کی کسی بھی سطح پر پیش گوئی کی اجازت نہیں دیتی لیکن یہ ہمیں موجودہ واقعے کی توجیہ کرنے کے قابل بناتی ہے ۔ جب علت کی تعریف شرط کے الجھاؤ کا ایک لمحۂ ضروری یا حالات کے تحت ضروری شرط کے طور پر بیان کی جاتی ہے تو یہ مانا جاتا ہے کہ ایک مؤرخ صرف یہ توجیہ بیان کرے گا کہ واقعہ E اس طرح کیوں ہوا ۔ یہ توجیہ مکمل ہے لیکن یہ مغالطہ علیت مقدم (Post-hoc) پیش کرتی ہے (یعنی واقعے کے بعد) اور اس توجیہ سے لازمی طور پر کسی بھی طرح پیش گوئی کا امکان نہیں ہوتا ۔ جے ۔ ایل ۔ ارن سن (J.L.Aronson) کی پیش کردہ مثال دیکھیے : فرض کیجیے ہمارے پاس ایک بندوق ہے جس سے گولیاں ایک دائرۂ قوت (Force Field) کے ذریعے اسکرین پر داغی جاتی ہیں ۔ دائرۂ قوت کا خاصہ یہ ہے کہ یہ قوت سمتیوں (Force vectors) سے مل کر بنتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ پوری طرح اتفاقی طور پر تبدیل ہوتی ہیں ۔ اس صورت میں، ہم پہلے سے یہ پیش گوئی نہیں کرسکتے کہ گولی کہاں لگے گی لیکن جب گولی ایک بار اسکرین تک پہنچ جاتی ہے تو ہم یہ وضاحت کرسکتے ہیں کہ وہ نشانے پر کیسے لگی ۔ واقعے کے بعد ہم یہ چھان بین کرسکتے ہیں کہ گولی کی رفتار کیا تھی، وہ زاویہ جس میں گولی لگنے کے وقت سمتیے (Vectors) لازمی طور پر موجود تھے، بندوق کی پوزیشن، رگڑ (Friction) اور دوسرے مانع عناصر ، اور ان عناصر کی بنیاد پر یہ وضاحت و توجیہ کہ گولی اسکرین کے P نشانے تک کیوں پہنچی ۔ یہ وضاحت اس ذیل میں کیوں سوال کا اطمینان بخش مکمل جواب فراہم کرتی ہے لیکن یہ ہماری اس پیش گوئی میں معاونت نہیں کرسکتی کہ اگلی گولی اسکرین پر کہاں لگے گی ۔

تاریخی توجیہات اکثر اسی نوع کی ہوتی ہیں ۔ یہ پوری وضاحت کرتی ہیں کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا لیکن یہ کسی بھی طرح کی پیش گوئی نہیں کرتی ۔ اصول و قانون (Laws) طے شدہ علی رابطوں (Connections) میں پنہاں ہوسکتے ہیں لیکن مؤرخ نہ تو ان اصول و قوانین کو کھود کر نکالتا ہے نہ ہی اس کا یہ کام ہے (دیکھیے ڈرے :Dray 1970) ۔ تاریخی غور و فکر کا مقصد عام اصولوں کو دریافت کرنا نہیں ہوتا، وہ علی توجیہات پیش کرتی ہے تاکہ پیش گوئیوں سے وہ لازمی طور پر متمائز ہوسکے ۔ یہ حقیقت کہ وہ پیش گوئی اور قطعی اصولوں کے مجموعے کو تلاش نہیں کرتے اور وہ ابتدائی شرطیں جن کے تحت وہ عمل کرتے ہیں اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ جزوی توجیہات پیش کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس ''وضاحتی قانونی ماڈل'' (Covering Law model) میں جو کارل ہیمپل (Carl Hempel) اور دیگر سماجی علوم کے اثباتیت پسند فلسفیوں کا طریقۂ کار ہے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مؤرخین کیا ہوا کی واحد علی دعاوی کے ذریعے مکمل توجیہ کرتے ہیں ۔

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ یہ واحد علی دعاوی وجوہات اور مقاصد میں شامل توجیہات سے ممیز ہوتے ہیں ۔ وہ واقعات جن کا مؤرخ

مطالعہ کرتے ہیں مثلاً باغی، لڑائیاں، امن معاہدے، تحریکیں، بغاوتیں وغیرہ تمام واقعات افراد اور گروپوں کے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان واقعات کے مطالعے میں مؤرخین اکثر کیا ہوا اور کیوں ہوا کو کرداروں کے ارادوں اور محرکات کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ عدم تعاون کی تحریک کی واپسی کو اس کے لیڈروں کے ارادوں کے بطور واضح کرتے ہیں، اس معاملے میں جیسے گاندھی جی۔ اسباب جو وہ گاہے گاہے تسلیم کرتے ہیں وہ ہی ہوتے ہیں جن کا اعلان ان کے ایجنٹ (Agent) خود کرتے ہیں یا وہ ہوتے ہیں جو مقاصد سے مستخرج کیے جاسکتے ہیں۔ یہ مقاصد یا تو ان کے اعلان کردہ ہوتے ہیں یا ایجنٹوں سے مناسب طور پر منسوب کیے جاتے ہیں۔ جو بھی ہو مناسب سبب کی شناخت کی بنیاد جو معنی خیز ہو وہ یہ ہے کہ واقعات کے ساتھ صرف خارجی دنیا میں واقع ہونے کی حیثیت سے برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا خاص ایجنٹوں کی کارکردگی کی حیثیت سے ادراک کیا جاتا ہے جن کی توجیہ نمایاں اسباب اور محرکات کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کی سبب۔ عمل توجیہات کو علی توجیہات کی طرح تواتر کے ساتھ برتا جاتا ہے اور اسباب اکثر علتوں کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اسباب مقاصد محرکات اور عمل (action) کے درمیان ایک ربط قائم کر کے توضیح کرتے ہیں۔ اسی طرح علی توجیہات علت اور معلول کے درمیان ربط پیدا کرتی ہیں۔ اگرچہ عقائد اور محرکات اکثر ایک دیے ہوئے واقع کے پیش کار (Producing) کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسباب (reasons) علتوں کی صحیح نوع نہیں ہیں۔

ایک علی توضیح میں، علتیں خارجی شرطیں ہیں جو اس مادی دنیا میں عمل پیرا ہیں اور علت اتفاقی طور پر معلول یا اثر سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسباب (Reasons) داخلی طور پر مربوط ہوتے ہیں اور ایک سبب اور عمل کے درمیان ربط منطقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ وضاحت کرتے ہیں کہ .B نے A کو کیوں قتل کیا اور بدلے کی نشاندہی اس عمل کے محرک کے طور پر کرتے ہیں، تو ہم محرک۔ سبب اور عمل قتل کے درمیان ایک ذاتی ربط تجویز کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قتل کا سبب بدلہ اس بات پر مزید روشنی نہیں ڈالتا ہے کہ بعد کا واقعہ پہلے واقعے کے مطابق ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ہمیں اس بات کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ قتل مذکورہ فرد نے کیا تھا اور وہ اس تحریک کا حامل ہوسکتا تھا لیکن محرک اور عمل کے درمیان ربط (Link) قائم کرنے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل عمل کو تحریک کا تابع کہا جاتا ہے اور اس تحریک سے متصف ہونا اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ایک مناسب سبب ہے کہ وہ یہ عمل کرسکتا تھا۔ اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عوامی حمایت میں کمی ہڑتال کو واپس لینے کے فیصلے کا سبب تھی تو ایک داخلی ربط سبب اور عمل کے درمیان قائم ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ مسلماتی ربط (Postulated Connection) عقلی رویہ (Rational Behaviour) کے مفروضے (Assumption) پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ عقائد کے ایک پس منظر کے طور پر پہلے سے قیاس کرلیا جاتا ہے جو دیے ہوئے عمل پر اکساتا ہے۔ مثال کے طور پر ہڑتال کی واپسی کا فیصلہ کیوں کہ یہ معاونین کی حمایت کھو رہی تھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ لیڈران نے ہڑتال کی ناکامی سے پہلے اسے واپس لینا مناسب سمجھا یا انہوں نے ہڑتال کے خاتمے کو اس لیے ترجیح دی تا کہ انہیں حاصل شدہ فوائد سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔ اسی طرح کے مفادات کے عقلی آنکڑے سبب عمل توجیہ کے لازمی جز وہوتے ہیں لیکن یہ مسلمات ان ابتدائی شرطوں کے طور پر نہیں تسلیم کیے جاتے ہیں نہ ہی تسلیم کیے جانا چاہئیں جن کے تحت مخصوص اصول عمل پیرا ہوتے ہیں۔

سبب۔ عمل توجیہات اپنی فطرت میں نمائی (Teleological) ہوتی ہیں۔ یہاں حسب منشا منتہائے حالت (End-State) جو عمل کے ذریعہ قبول کی جائے ایک محرک یا مقصد ہوتی ہے۔ اس طرح یہ منطقی طور پر کارروائی سے پہلے ہوتا ہے۔ دوسری طرف علی توجیہ میں اثر یا معلول علت کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی یہ علّی شرط کے بعد ہوتا ہے اور یہ اسے مخصوص عطفی شرطوں کی موجودگی کی وجہ سے قبول کرتا ہے۔ علی توجیہات پیش کرتے ہوئے مؤرخین شرطوں کے اس مجموعہ کی تحقیق و جستجو کرتے ہیں جو مجموعی طور پر موجود اثر کو پیدا کرتی ہیں اور اس اجتماعیت کے ذیل میں ان کا مقصد ایک ایسی شرط کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے جس نے فیصلہ کن تبدیلی پیدا کی۔ یہ توجیہات اسباب پر مبنی توجیہات سے ممیز ہوتی ہیں اور وضاحتی قانونی ماڈل سے بھی جو اثباتیت پسندوں کا طریقہ کار رہے۔ مزید یہ کہ جیسا کہ پہلے بحث کی گئی ہے کہ یہ وہ توجیہات ہیں جو ہمیں بتاتی ہیں کہ ایک خاص واقعہ ایک خاص وقت میں کیوں ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یہ وہ واحد علی بیانات ہیں جو واقعات کی وضاحت کرتے ہیں، مستقبل میں ہونے والے واقعات کی پیش گوئی نہیں کرتے۔ ان توجیہات میں پیش گوئی کی اضافی نفی تاہم ان توجیہات کو کمزور نہیں بناتی نا ہی انہیں تشنۂ تکمیل چھوڑتی۔ یہ پیش کردہ توجیہات مکمل ہوتی ہیں اور ان کی صداقت پر فراہم ثبوتوں اور دستاویزوں کی بنیاد پر مؤرخین کے حلقے میں بحث و گفتگو ہوسکتی ہے۔

Summary — 2.5 خلاصہ

تاریخ کے علم میں دوسرے سماجی علوم کی طرح علتوں کی تحقیق وجستجو ہوتی ہے جومختلف مظاہر کی نمود کا باعث ہوتی ہیں۔علتوں کی تحقیق تاریخی تجزیے میں نتیجہ خیز ہوتی ہے۔علتیں ان خاص واقعات کی طرح نہیں ہوتیں جو دوسرے مخصوص واقعات سے پہلے ہوتے ہیں جن کا ماخذ ان کے ماقبل واقع میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔اس کے بجائے علتیں شرطوں کے ایک مجموعے کے طور پر سمجھی جاتی ہیں جن کے تحت خاص واقعات موجود ہوتے ہیں۔یہ شرطیں ضروری اور حسب ضرورت دونوں طرح کے منصے خاص واقعات کے ہونے کے لیے فراہم کرتی ہیں۔تاہم طبیعی علوم کی طرح تاریخ میں علت کی تلاش وجستجو کے لیے لباریٹری کی طرح کنٹرول ماحول کا التزام نہیں کیا جا سکتا۔اس کے بجائے سماجی علوم کے ماہر ایک واقعے کے وقوع ہونے کے لیے یکساں یا مختلف شرطوں کو تلاش کرتے ہیں جو واقعے کے ہونے کے وقت موجود تھیں اور جو اس وقت غیر موجود تھیں۔مزید براں علتیں ایک مظہر کی توجیہ کرتی ہیں ان کی پیش گوئی نہیں کرتیں۔

Exercises — 2.6 مشقیں

(1) علیت کیا ہے؟اس کو ایک مظہر یا وقوع کی توجیہ کے لیے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

(2) ایک مظہر کی علتوں کی تلاش وجستجو میں طبیعی علوم کے ماہر اور سماجی علوم کے ماہرین کی مختلف طرز رسائیوں سے بحث کیجیے۔

(3) علیت کے قیام اور ایک واقعے کے ہونے کی توجیہ کرنے کے تاریخ کے طریقۂ کار سے بحث کیجیے۔

Suggested Readings — 2.7 مجوزہ کتابیں

G.E.M. Anscombe, 'Causality and Determination' in E.Sosa (ed.), *Causation and Conditionals* (Oxford, Oxford University Press, 1975).

J.L.Aronson, *Realist Philosophy of Science* (London: Macmillan 1984).

Isaiah Berlin, *Concepts and Categories* (Oxford, Oxford University Press 1980)

Wilhelm Dilthey, *Introduction to the Human Sciences* (trans. and edited by H.P.Rickman),(Cambridage: Cambridge University Press, 1988).

W.H. Dray, *Laws and Explanations in History* (Oxford, Clarendon press,1970).

Patrick Gardiner, *The Nature of Historical Explanation*(Oxford, Oxford University Press, 1961)

M.Grinsberg, 'Causality in Social Science', Proceedings of the Aristoteliam S.H.L.A. Hart and A.M. Honore, *Causation in the law* (Oxford, Clarendon Press 1973).

Carl G. Hempel,' The Function of Laws in History', in P. Gardiner (ed). *Theories of History* (New York, The Free Press, 1959)

J.L. Mackie, ' Causes and Conditions', in E.Sosa(ed), *Causation and Conditionals* (Oxford University Press 1975).

John S.Mill, *Collected Works*,Vol VII: A System of Logic Ratiocinative and Inductive, Books 1-III, (edited by J.M.Robson, Toronto, Toronto University Press, 1978)

Gilbert Ryle, *The Concept of Mind* (Harmondsworth, Penguin Books, 1980)

Rbert K. Shope,'Explanation in Terms of the Causes,' Journal of Philosophy,Vol.LXIV/10,pp.312-320,1976

Wilhelm Windelband, 'On History and Natural Sciences', Rectorial Address, Strasbourg, 1894, (trans.by Guy Oakes) *History and Theory,* 19/2,169-85,1980.

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD
Accn. No. MA-0446
Date: 03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-34.

Objectivity and Interpretation اکائی:3 معروضیت اور تعبیر

Structure ساخت

Introduction	تعارف	3.1
What is objectivity	معروضیت کیا ہے	3.2
Development of the Principal of Objectivity	معروضیت کے اصول کا ارتقاء	3.3
Critiques of Objectivity	معروضیت کی تنقیدیں	3.4
Constraints of Evidance and Individual Bias	ثبوت کی پابندی اور ذاتی تعصب	3.4.1
Cultural Relativism	تہذیبی اضافیت	3.4.2
Linguistic and Postmodern Turn	لسانی اور مابعد جدید موڑ	3.4.3
Historian Concern	مؤرخین کی تشویش	3.5
Possibility of Objectivity	معروضیت کا امکان	3.6
Summary	تلخیص	3.7
Exercises	مشقیں	3.8
Suggested Readings	کتب برائے مطالعہ	3.9

Introduction 3.1 تعارف

معروضیت کا اصول مغربی تاریخ نویس میں ایک زمانے سے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ درحقیقت یہی بنیاد ہے جس پر تاریخی کارگزاریوں کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ مغربی دنیا میں ابتدائی دورے سے ہی مؤرخین کا یہ ایقان رہا ہے کہ ماضی کے تعلق سے ان کی تحریریں صادق اور معروضی ہیں۔ اس ایقان کو بہت سے فلسفیوں اور مفکرین نے چیلنج بھی کیا جو کہتے ہیں کہ معروضیت کی تلاش ایک کارعبث ہے۔ تاہم تاریخ نویسی کا عام دھارا معروضیت کے تصور پر قائم رہا۔ ایک امریکی مؤرخ اور معروضیت کے اصول کا انتہا پسند ناقد پیٹر نووک (Peter Novick) کے الفاظ میں یہ ایسی چٹان تھی جس پر (تاریخی) خطرناک مہم بنائی گئی ہے۔ اور اس کی مسلسل علت غائی اگر سب نہیں تو اکثر مؤرخین نے اسی یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کی تحریروں نے دنیا کی معروضی تصویر پیش کی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف رائے پیدا ہوا تو انہوں نے یہی خیال کیا کہ ان کی پیش کش دوسروں کے مقابلے میں زیادہ معروضی ہے۔ اس طرح معروضیت کے تعلق سے خوب تاریخی اٹھا پٹک بھی رہی۔ لیکن 1970ء کے بعد سے معروضیت کے خیال کو زبردست چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا اور اب بانگ دہل یہ دعویٰ کرنا نہایت ہی دشوار ہو گیا ہے کہ تاریخ نویسی میں معروضیت کا حصول ممکن ہے۔ دراصل معروضیت کے ناقد اس پر شک کرتے ہیں کہ آیا معروضیت کا حصول مناسب ہے۔ تنازع کے بدترین صورت اختیار کر لینے کے باوجود ابھی تک مؤرخین اس یقین کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ماضی کی حقیقی تصویر کو پیش کرنا ممکن ہے۔ اس اکائی میں طلباء کو اس تنازع کے کئی پہلوؤں کی بابت معلومات فراہم کی جائے گی۔

What is Objectivity — 3.2 معروضیت کیا ہے؟

معروضیت کو مغرب کی تاریخ نویسی کی روایت میں بنیادی اصول کی حیثیت کا حاصل رہی ہے۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) کے دور سے ہی مؤرخین موضوع اور معروض جو چیز کو معلوم کر رہا ہے اور جو معلوم ہے، کے درمیان تفریق اور ماضی کی دریافت کے امکان کے قائل رہے ہیں۔ معروضیت کے اصول کے ناقد پیٹر ناوک (Peter Novick) نے معروضیت کی تعریف واضح انداز میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

''مثالی معروضیت کے بنیادی عناصر بہت معروف ہیں۔ جنہیں مختصراً بیان کیا جاسکتا ہے۔ جن مفروضوں پر معروضیت کی عمارت کھڑی ہے ان میں ماضی کی حقیقت سے وابستگی اور اس صداقت سے جو اس حقیقت تک رسائی کا ذریعہ ہے، جاننے والے (Knower) اور جانی ہوئی شئے (Known) کے درمیان، حقیقت اور اقدار کے درمیان اور ان سے بڑھ کر تاریخ اور افسانے کے درمیان واضح تفریق شامل ہے۔ تاریخی حقائق مقدم اور تعبیر سے آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ تعبیری قدر کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے حقائق کی توجیہ کہاں تک ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں میں تضاد پایا جاتا ہے تو پھر اس سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔ حقیقت بہر حال ایک ہی ہوتی ہے۔ تاریخ کے جو خاکے موجود ہیں وہ حاصل شدہ ہیں، بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر چہ ان کے بھی پس منظر میں تبدیلی کی وجہ سے بعد میں آنے والے مؤرخین نے ماضی کے واقعات کو مختلف معانی پہنائے لیکن ان واقعات کا مفہوم نا قابل تبدیل ہے۔''

(Peter Novik, *That Noble Dream : The "Objectivity Question" and theAmerican Historical profession, Cambridge* : LUP 1988, PP 1-2)

تاہم اس مقصد کے لیے مؤرخین کو بالکل غیر جانبدار ہونا پڑے گا اور اپنے ذاتی نظریات کو الگ رکھ کر ثبوتوں کی صداقت پر ہی اعتماد کرنا پڑے گا: پیٹر نووک کے الفاظ میں:

''ایک معروضیت پسند مؤرخ کا کردار غیر جانب دار یا بے غرض ایک جج کی طرح ہوتا ہے۔ اسے کبھی بھی اتنا نہیں گرنا چاہیئے کہ اس کی حیثیت ایک وکیل کی یا اس سے بھی بدتر ایک پروپیگنڈا کرنے والے کی نظر آنے لگے۔ مؤرخ کے پیش کردہ نتائج سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان میں توازن، غیر جانب داری اور عدالتی خوبیوں کا معیار ہو۔ ٹھیک عدلیہ ہی کی طرح ان خوبیوں برقرار رکھنے کے لئے تاریخی پیشہ کو سماجی دباؤ یا سیاسی چھاپ سے دور رکھا جاتا ہے اور ذاتی طور پر بھی مؤرخ کسی کی حمایت یا تعصب سے اجتناب برتا ہے۔ وہ ایک نتیجہ کو چھوڑ کر دوسرے نتیجہ تک پہونچے کے لئے اپنی طرف سے کچھ بھی شامل نہیں کرتا ہے۔ معروضیت اس وقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے جب افادی مقاصد کے لیے تاریخ لکھی جارہی ہو، اس بحث کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ مؤرخین کو مؤرخین کی حیثیت سے خود کو خارجی وفاداریوں سے دور رکھنا چاہیئے۔ مؤرخین کو سب سے پہلے معروضی تاریخی صداقت کا متبع ہونا چاہیئے۔ اور پھر ان ہم پیشہ دوستوں کا اتباع کرنا چاہیئے جن کا اس مقصد تک پہنچنے کے لئے کی جانے والی مجموعی کوششوں میں تعاون حاصل ہو۔''

مؤرخ تھامس ہاسکل (Thomas Haskell) نے معروضیت اور غیر جانبداری کے اختلاط پر سوال اٹھایا ہے۔ معروضیت غیر جانبداری نہیں ہے کہ عنوان سے اپنے ایک مضمون میں اس نے یہ استدلال کیا کہ معروضیت اور غیر جانبداری دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حالانکہ انیسویں صدی کی تاریخ نویسی میں ان دونوں کو ایک دوسرے کے مماثل قرار دیا گیا۔ اب تاریخی پیشہ سے متعلق افراد میں یہ اصطلاح اپنی قدر کھو چکی ہے بھلے ہی یہ کبھی غیر جذباتیت، بے رخی اور غیر جانبداری ہی کے مفہوم میں خصوصاً سمجھی جاتی ہو۔ اس سلسلے میں وہ مؤرخین کے کاموں کا حوالہ دیتا ہے۔ غلامی کی تاریخ لکھنے والے امریکی مؤرخ یوجین جینوویز (Eugene Genovese) کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی تاریخ معروضی ہے لیکن غیر جانبدار نہیں ہے۔ بالکل اپنی بات کو واضح انداز میں یوں کہتا ہے:

''معروضیت کا تصور میرے نزدیک...... گہری سیاسی وابستگی کے موافق ہے۔ اس میں بالکل بین بین کا راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ تسلیم کرتی ہے کہ اسکالر اتنے ہی جذباتی ہوتے ہیں، اتنے ہی ذاتی مفادات سے متاثر جتنا کہ وہ لوگ جن کے بارے میں لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو بالکل

علیحدہ رکھنے کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ بجز اس کے کوئی ناگزیر موقع ہو یا اعلیٰ سطح کی افہام و تفہیم کی کوشش ہو۔

اس طرح غیر جانبداری کے اعتبار سے معروضیت کے قدرے مختلف دو الگ الگ تصور موجود ہیں۔ تاہم دوسری چیزوں میں معروضیت تاریخ نویسی کا بنیادی اصول ہے۔ یہ پروپیگنڈہ اور خوش فہمی پر مبنی فکر الگ ثبوتوں اور دلائل پر بھروسہ کرتی ہے اور اس کے لئے اعلیٰ سطح کی فکر و نظر کی آزادی مطلوب ہے۔ یہی ساری چیزیں اس کے تعریف میں مشترک ہیں۔

5.2 معروضیت کے اصول کا ارتقاء

Development of thePrinciple of Objectivity

ماضی کی ایک حقیقت ہے اور تاریخی طور پر اس کا احاطہ ممکن ہے، یہ عقیدہ مغربی تاریخی نویسی کی روایت میں عام ہے۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) کے دور سے ہی مغربی دنیا میں تاریخ نویسی کے عام دھارے میں یہ خیال شامل رہا ہے کہ تاریخی ریکارڈ اصل ماضی اور اصل انسان کا پتہ دیتے ہیں۔ معروضیت پسند روایت، ماضی کی حقیقت اور اس کی حقیقی نمائندگی کے امکان دونوں میں ہی یقین رکھتی ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ لوگوں کے ارادوں اور کے اعمال کے درمیان تطابق ہے اور مؤرخین کو ماضی کے لوگوں کی نفسیاتی دنیا کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جدید سائنس کی ترقی نے اس عقیدے میں ایک نئے ابعاد کا اضافہ کیا۔ اب یہ دعویٰ کیا جانے لگا، کہ سائنس میں استعمال ہونے والے طریقوں کو انسانی علوم کے مختلف شعبوں پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اثباتیوں (Positivists) نے اس بات کو زور شور سے اٹھایا، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں یہ ایک عام خیال بن گیا آگست کومٹے (August Comte) اثباتیت (Positivism) کے بانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نیچرل سائنس میں استعمال ہونے والے استقرائی طریقوں کو نہ صرف تاریخ بلکہ عام علوم انسانی میں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے علوم انسانی کو بھی سائنٹفک حیثیت کا حامل قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ تمام معاشرے مخصوص قوانین کے ذریعہ کام کرتے ہیں۔ ان عام قوانین کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق معاشرے تاریخی طور پر ارتقاء کے تین مرحلوں سے گذرے ہیں۔ وہ مرحلے یہ ہیں :

(i) دینیاتی (Theological) مرحلہ: اس دوران انسانی ذہن طفولیت کے دور میں تھا اور طبیعی مظہر کو خدائی یا مافوق الفطری طاقتوں کا نتیجہ قرار دیا جاتا تھا۔

(ii) مابعد الطبیعاتی یا تجریدی (The Metaphysical) مرحلہ : یہ عبوری مرحلہ تھا جس کے دوران انسانی ذہن اپنے بلوغت کے دور سے گذرا۔ اس مرحلہ میں فطرت کے عمل کو پُر اسرار طاقتوں کا نتیجہ قرار دیا گیا۔

(iii) اثباتی (Positive) مرحلہ: جو انسانی ذہن کی پختگی اور انسانی علم کی تکمیل کا شاہد ہے۔ اب فطری مظہر کے اسباب نہیں ڈھونڈے گئے، جب کہ ان کے اصولوں کو منکشف کرنے کے لیے تلاش کی گئی، مشاہدہ، توجیہ اور تجربے کے ذریعہ اس علم کو حاصل کیا گیا۔ یہ سائنسی دور تھا جو کہ انسانی سماج اور انسانی ذہن کی ترقی کا آخری مرحلہ ہے۔

کومٹے کے پیروکاروں کو اثباتی کہا گیا۔ ان لوگوں نے وقتاً فوقتاً تمام اداروں اور انسانی علم کے سارے شعبوں کے لیے مناسب آفاقی قوانین کی موجودگی کا دعویٰ کیا۔ تاہم وہ دوسری روایت تھی جس نے انیسوی صدی میں معروضی تاریخ کی بنیاد رکھی ۔ یہ روایت جرمنی میں نائبیر (Niebur) اور رینکے (Ranke) سے شروع ہوئی تھی۔ حالانکہ نائبیر نے سب سے پہلے تاریخ نویسی میں تنقیدی طریقۂ کار کو متعارف کرایا لیکن رینکے (Ranke) نے ہی صحیح معنی میں اور تفصیل کے ساتھ حقیقی معروضی تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی۔ اس نے واضح طور پر تاریخ کو لٹریچر اور فلسفہ سے الگ کیا۔ ایسا کر کے اس نے تاریخ کو تخیلات اور مابعد الطبیعاتی قیاس کی زیادتی سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک مؤرخین کا کام ماضی کو اسی کے اپنے عہد میں ڈھونڈنا اور قارئین کو یہ بتانا ہے کہ وہ کیسا تھا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ریکارڈ پر اندھا دھند اعتماد کیا جائے۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ مؤرخین ذرائع کو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ لیں اور ان کی اندرونی ہم آہنگی کی تلاش کریں تا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ حقیقی ہیں یا بعد کے اضافے ہیں، وہ چاہتا تھا کہ مؤرخین تمام

ذرائع کی جانچ کر کے تصدیق کریں پھران پر اعتماد کریں۔ جب ایک بار یہ ثابت ہو جائے کہ ریکارڈ حقیقی ہیں اور مؤرخ جس عہد کا مطالعہ کر رہا ہے اس عہد سے متعلق ہیں تب مؤرخ ان پر مکمل اعتماد کر سکتا ہے۔ وہ ان ریکارڈوں کو ابتدائی ذرائع قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہی ذرائع معاصر عہد کی حقیقی نمائندگی کے لیے بنیاد فراہم کریں گے۔ اس طرح مؤرخین کو چاہیے کہ شائع شدہ مواد سے زیادہ محافظ خانہ میں محفوظ ریکارڈ پر ہی اعتماد کریں کیونکہ شائع شدہ مواد تعصب پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس کا خیال ہے کہ ماضی کی از سر نو تشکیل ممکن ہے اور اس میں معروضیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

اس رجحان کا سارا زور اس پر ہے کہ حقائق ریکارڈز میں موجود ہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ مؤرخین ان کو دریافت کریں، اگر مؤرخین غیر جانبداری سے کام لیں، ایک مناسب سائنٹفک طریقہ اختیار کریں، اور چھان بین کے عمل میں اپنی ذات کو دور رکھیں، تو ان حقائق کی روشنی میں ماضی کو دریافت کرنا ممکن ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں حقائق پر بڑا اعتماد کیا جاتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر سارے حقائق کا علم ہو تو ایک اصلی تاریخ (Date) کی تدوین ممکن ہے جو نا قابل منسوخ ہوگی۔ جیسا کہ تاریخ کے پروفیسر اور Cambridge Modern History کے پہلے ایڈیشن کے ایڈیٹر لارڈ ایکٹن (Lord Action) نے بھی کہا ہے:

''آج کے عہد میں ہم اصلی تاریخ مدون نہیں کر سکتے لیکن ہم روایتی تاریخ سے نجات حاصل کر کے یہ ضرور ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہم نے دوسرے ذرائع تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ اب ساری اطلاعات ہماری دسترس میں ہیں اور ہر دشواری کا حل موجود ہے۔''

تمام ذرائع تک رسائی حاصل کرنے اور ایک تاریخ تدوین کرنے کی اہلیت کے تعلق سے یہ خود اعتمادی ان کے اس خیال میں بھی جھلکتی ہے کہ مکمل معروضیت اختیار کی جا سکتی ہے جو کہ قومیت، زبان اور مذہب سے بلند تر ہوگی۔ چنانچہ (Cambridge Modern History) کے مضمون نگاروں کو ہدایت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سبھی مضمون نگاروں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ ہمارا انداز تحریر اس طرح ہو کہ فرانسیسی، انگریز، جرمن اور ڈچ اس سے یکساں طور پر مطمئن ہوں کہ کوئی بھی مصنفین کی فہرست دیکھے بغیر نہ کہہ سکے کہ جہاں آکسفورڈ کے بشپ نے قلم رکھ دیا وہیں سے فیر برن (Fairburn) یا گاسکے (Gasquet) یا لیبر مین (Libermann) یا ہیریسن (Harrison) نے اٹھا لیا۔''

تمام ماخذوں کو افشا کرنے اور اس طرح اصلی تاریخ نویسی کے اس عقیدے کو فرانسیسی مؤرخین لانگ لوئس (Long lois) اور سینو بوس (Scignobos) نے تاریخی طریقہ کار کے بارے میں اپنی بیحد مقبول نصابی کتاب میں بڑے زور کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''جب سارے دستاویزات معلوم ہوں اور پوری چھان بین کے بعد ہمارے یہ استعمال کے لائق قرار دے گئے ہوں تو اب تنقید کا عمل مکمل ہو گیا۔ قدیم دور کے معاملے میں جس سے متعلق دستاویزات بھی شاذ و نادر ہوں ہمیں ایک یا دو نسل کے بعد کے واقعات ہی معلوم ہو پاتے ہوں تو اس مرحلہ پر ہمیں رک جانا چاہیے۔''

تاریخ کی سائنسی حقیت کا پوری شدومد کے ساتھ دعویٰ جے۔ بی۔ بیری (J. B. Bury) نے پیش کیا جو کیمبرج میں پروفیسر آکٹن کا جانشین بنا۔ اس کا خیال تھا کہ اگرچہ تاریخ لٹریری آرٹ اور فلسفیانہ قیاس کے لیے مواد فراہم کرتی ہے لیکن بذات خود یہ ایک سائنس ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہاں تک جارج کلارک (George Clark) نے Cambridge Modern History کی دوسری اشاعت کے عام تعارف میں یقینی حقائق اور مشتبہ تعبیرات کے انبار کے درمیان فرق کیا ہے حالانکہ وہ خود اصلی تاریخ (Ultimate History) کی تدوین کے امکان میں یقین نہیں رکھتا۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تعبیر کا رول بہت تھوڑا ہوتا ہے، تاریخ نویسی عام طور پر دستاویزات سے متعلق ہوتی ہے۔ جب کسی عہد سے متعلق دستاویزات موجود ہوں تو یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ان کی توثیق کرنے والا مؤرخ کون ہے۔

اسی تناظر میں ای۔ایچ کار (E. H. Carr) لکھتے ہیں:

تاریخ تحقیق شدہ حقائق کے مجموعے سے مرکب ہوتی ہے۔مؤرخین کو حقائق دستاویزات میں،نقوش میں،اور اس نوعیت کی دیگر چیزوں میں پھنسے ہوئے ملتے ہیں جس طرح کہ مچھلی مچھیرے کے جال میں۔مؤرخ انہیں جمع کرتا ہے،گھر لاتا ہے اور انہیں اپنے اسلوب میں تیار کرتا ہے اور اپنے انداز سے پیش کرتا ہے۔"

لیکن انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے اس قسم کے خیالات غیر معقول لگنے لگے تھے۔علم آثار قدیمہ اور دیگر شعبوں میں نئی تکنیکوں کے استعمال سے بالکل قدیم سوسائٹیز کے بارے میں روز افزوں معلومات سامنے آنے لگیں۔مزید یہ کہ بیسوی صدی کے آغاز میں ہی تاریخ نویسی نے اس سیاسی تاریخ سے ہٹ کر دوسری ڈگر پر بھی قدم رکھ دیا جو کہ انیسویں صدی کے مؤرخین کا خاص موضوع تھا،سماجی،اقتصادی اور تہذیبی تاریخیں لکھی جانے لگیں۔مؤرخین پہلے سے دستیاب دستاویزات کا مطالعہ نئے زاویہ نگاہ سے اور مختلف مقاصد سے کرنے لگے۔اس کی بھی نشاندہی کی گئی کہ اب تک کے مؤرخین کے کام بشمول رینکے (Ranke) جس نے مکمل معروضیت کی بات کہی تھی اور ابتدائی ذرائع کے استعمال کا دعویٰ کیا تھا،صنائی (Rehetorical) سے خالی نہیں ہیں اور اکثر و بیشتر ان شائع شدہ مواد پر مبنی ہیں جو ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی میں رینکین روایت کی یہ کہہ کر تنقید کی گئی کہ اس میں بہت بھولا پن ہے اور یہ عمومی تصویر کے بجائے ذاتی حقائق سے متعلق ہے۔اس پر مزید یہ بھی تنقید کی گئی کہ یہ بڑی حد تک سیاست اور ممتاز افراد سے ہی متعلق ہے۔بیسویں صدی میں تاریخ نویسی میں پیدا شدہ نئے رجحان نے سیاست سے بالکل ہٹ کر اقتصادیات اور سماجیات اور ممتاز افراد سے ہٹ کر عام لوگوں پر اپنی توجہ مبذول کی۔ان رجحانات میں سب سے زیادہ مؤثر مارکسسٹ اور انالیس (Arnales) تاریخ نویسی کے دبستان ہیں،تاہم ان رجحانات اور رینکین روایت میں دو مرکزی خیال قدرے مشترک رہے۔ان رجحانات میں بھی یہ عقیدہ باقی رہا کہ تاریخ کو سائنٹفک انداز میں اور معروضیت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے،جس مخصوص سمت کی طرف مسلسل طور پر تاریخ گامزن تھی۔

لیکن تاریخ نویسی کے سائنٹفک اور معروضی دعوے کافی حد تک جنگوں کے دوران کمزور ہو گئے۔ریکارڈ اور حقائق کے ساتھ مختلف قومی سیاسی اداروں نے اندھادھند چھیڑ چھاڑ کی۔مختلف حکومتوں اور ان سے متعلق دانشوروں کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے بھی جانب دارانہ دعوے ہوتے رہے۔تاریخ نویس بھی اس پوری صورتحال سے متاثر ہوئی۔دوسری عالمی جنگ کے بعد،سرد جنگ کا زبردست اثر تعلیمی اداروں پر بھی پڑا اور دانشوروں سے کہا گیا کہ وہ یا تو حمایت کریں بصورت دیگر خود کو ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی آراء کو ظاہر نہ کریں۔

اس صورت حال کے باوجود اکثر و بیشتر مؤرخین نے تاریخ نویسی میں معروضیت کے امکان پر اپنا عقیدہ برقرار رکھا۔1820ء میں رینکے سے لے کر 1970ء میں روبرٹ فوگل (Robert Fogel) تک معروضیت کے حامی تاریخ کی سائنٹفک حیثیت کی بات کرتے رہے۔ان کی رائے تھی کہ اگر جانچ پڑتال کے مناسب سائنٹفک طریقہ استعمال کئے جائیں تو یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ دراصل ماضی میں واقعی کیا ہوا تھا۔اس کے لیے یہ نہایت ہی ضروری تھا کہ تاریخ اور لٹریچر کے درمیان فرق کو واضح کریں۔

3.4 معروضیت کی تنقید — Critiques of Objectivity

بیسوی صدی کے آخر میں تاریخ کی معروضیت اور اس کو سائنٹفک قرار دینے کے خیال کو اس وقت نئے نئے انتہا پسندانہ چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ماہرین انسانیات جیسے کلاوڈ لیوی اسٹراس (Calude levi Strauss) نے یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لحاظ سے عقلیت اور سائنس پر مبنی جدید مغربی تہذیب کی بھی صورت ماقبل جدید عہد یا وحشی انسانوں سے بہتر ہے۔ دوسری سطح پر بہت سارے مؤرخین اور تاریخ کے نظریہ سازوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ تاریخ،سائنس کے مقابلے لٹریچر سے زیادہ قریب ہے۔مزید یہ کہ سوسیر (Sassuer) سے شروع ہونے والے نئے لسانی نظریات نے کھلے طور پر اعتراف کر لیا کہ زبان کا رول حقیت کو پیش کرنا نہیں بلکہ حقیقت کی تعمیر ہے۔اس طرح جو دنیا ہم تک زبان کے

واسطے سے پہنچی ہے وہ اصل دنیا نہیں ہے۔اس طرح مؤرخین نے ماضی کے جو واقعات پیش کیے ہیں ان کا تعلق اصل ماضی سے نہیں بلکہ اس دنیا سے جو خود ان مؤرخین کی تراشی ہوئی ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ مؤرخ کی بیان کردہ ایک کہانی ہے۔تاریخ کے ایک امریکی فلسفی لوئیس مینک (luis Mink) کے الفاظ میں کہانیوں کا کہیں وجود نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف بیان کی جاتی ہیں۔مینک آگے کہتا ہے کہ زندگی کا نہ آغاز ہے، نہ درمیان، نہ اختتام۔ آغاز و اختتام صرف کہانیوں میں ہوتے ہیں اور اسی طرح تاریخ میں۔اس طرح تاریخ بھی کافی حد تک کہانی ہی کی طرح ہے حالانکہ وہ مخصوص امور سے متعلق ہے۔تاریخی معروضیت کے تصور پر مختصراً تین سطح پر تنقید کی جاتی ہے:ثبوتوں کا دباؤ،ذاتی تعصب،تہذیبی اضافیت اور مابعد جدیدیت اور لسانی تبدیلی۔

3.4.1 ثبوت کی پابندیاں اور ذاتی تعصب

Constraints of Evidence and Individual Bias

عظیم جرمن فلسفی کانٹ (Kant) نے جو کہ روشن خیالی کے تصورات سے متاثر تھا، یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی دنیا کو اسی طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے جس طرح نیچرل دنیا کو، جس کو فلسفیانہ تلاش کی تنقید کے لیے ڈیلتھی (Dilthey) کروک (Croce) کولنگ وڈ (Collingwood) اور آکشوٹ (Okeshott) نے آگے بڑھایا۔کانٹ کا فارمولا یہ تھا کہ حقیقی دنیا اور اس موضوع کے درمیان جس کے تحت اسے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، بڑا فرق ہے۔اس فارمولے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ حقیقت کی از سر نو تعمیر ممکن نہیں اور موجودہ حقائق کی اس حقیقت سے مطابقت کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نظریہ بعد میں ترقی کر کے اس خیال کے لیے بھی چیلنج بن گیا کہ تاریخ سائنس کی طرح ہو سکتی ہے۔تاہم نیٹشے (Nietzsche) کی فلسفیانہ فکر کی اس روایت نے معروضی تاریخ نویسی کے لیے بہت زبردست چیلنج پیدا کیے۔ایک جرمن فلسفی ولہیلم ڈیلتھے (Wilhelm (1833-1911) Dilthey) نے سائنسی علم اور تہذیبی علم کے درمیان حد بندی کی۔*(Introduction to Historical Knowledge)* کے عنوان سے 1883 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب اور بعد کے کچھ مضامین میں انہوں نے سائنس اور تاریخ کے درمیان فرق کیا ہے اور ان دونوں موضوعات کی تحقیق کے لئے الگ الگ میدان، الگ الگ تجربات اور محققین کے الگ الگ رجحانات کو اس تفریق کی بنیاد بنایا۔اس کے مطابق کائنات کی حقیقت معلوم کرتے وقت ایک سائنسداں کی حیثیت خارجی ہوتی جب کہ حقیقت کی تعمیر کے عمل میں مؤرخ خود بھی ملوث ہوتا ہے۔اس طرح ایک سائنسداں کے برخلاف مؤرخ صرف ایک مشاہد بن کر نہیں رہ سکتا۔چنانچہ تاریخ نویسی میں معروضیت کو برقرار رکھنا ناممکن ہے۔

بینڈیٹو کروچے (Benedetto Croke)(1886-1952) جو کہ اطالوی مؤرخ اور مفکر تھا، اس معاملے میں ڈیلتھی سے اتفاق کرتا ہے کہ سائنس اور تاریخ کے درمیان بنیادی فرق ہے۔اس کے مطابق ماضی کا وجود صرف مؤرخین کے ذہنوں کے توسط سے ہے۔اس نے اعلان کیا کہ ساری تاریخیں معاصر تاریخیں ہے۔تاہم ایک برطانوی مؤرخ اور فلسفی آر۔جی۔کولنگ ووڈ (R. G. Collingwood) نے اس قسم کی تنقید کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں۔اس کی موت کے بعد شائع ہونے والی کتاب *The Idea of History* میں اس نے تاریخی اضافیت کے اپنے نظریہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔وہ کہتا ہے ماضی کو صرف ماضی کے طور پر معلوم کرنا ناممکن ہے۔چنانچہ تاریخ پورے طور پر اصل ماضی نہیں ہے بلکہ مؤرخ کی تخلیق ہے۔اس کے نزدیک تاریخی فکر کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ دستیاب شواہد کی تعبیر اعلیٰ درجے کی تنقیدی مہارت کے ساتھ کی جائے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں جو کچھ رونما ہوا ہے اسے دریافت کیا جائے۔ہر مؤرخ خود کی تاریخ لکھتا جس میں کچھ چیزیں دوسروں سے مشترک بھی ہو سکتی ہیں اور نہیں بھی۔وہ لکھتا ہے:

> سینٹ آگسٹن نے تاریخ کو عیسائیت کے نظریہ سے دیکھا؛ ٹیلامونٹ (Tillamont) نے سترہویں صدی کے ایک فرانسیسی کے نظریہ سے، گبن (Gibbon) اٹھارہویں صدی کے انگریز کی نظر سے، مومسین (Mommsen) نے انیسویں صدی کے جرمن کی نظر سے—یہاں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی ہے کہ کون سا نظریہ صحیح تھا ہر نظریہ ممکن تھا جو اس کے اختیار کرنے پر منحصر تھا۔"

دراصل تاریخ ان ہی لوگوں نے لکھی ہے، جو بنیادی طور پر حال کے تعلق سے تشویش میں مبتلا تھے۔اور اس میں کچھ غلط بھی نہیں ہے۔کولنگ وڈ کہتے ہیں کہ چونکہ ماضی اپنے

آپ میں کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ ماضی کا علم بھی کوئی چیز نہیں ہے۔اور یہ مؤرخ کا مقصد بھی نہیں ہوسکتی ہے۔اس کا مقصد تو حال کے بارے میں پتہ لگانا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز واپس لوٹتی ہے۔اور ہر چیز دائرے میں گھومتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں مؤرخ کا اصل تعلق حال سے ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے اور چونکہ ماضی کے بارے میں ساری تاریخ مؤرخ کے ہی خیالات ہیں تو ساری تاریخ بس افکار کی تاریخ ہے۔

ای ایچ کار (E. H. Carr) نے ان میں سے کچھ نظریات کی تخلیص کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مؤرخین اپنے عہد کی ہی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی دنیا بھی ان کی معاصر دنیا کی سیاست اور خیالات سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ معاصر افکار سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ ماضی کو حال کے آئینہ میں ہی دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی نمائندگی کرتے ہوئے معروضیت پسند واقع ہونا ان کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ان کی تحقیقات اور پیش کش ہمیشہ ان کے حال کے افکار میں رنگی ہوتی ہے۔حتیٰ کے جو ثبوت وہ اکٹھا کرتے ہیں وہ بھی ماضی کی مکمل تصویر کو پیش نہیں کرتے کیونکہ ان کا انتخاب ان کے زمانے کے مروجہ خیالات اور نظریاتی رجحان کے مطابق ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ ریکارڈ جو ماضی کے لوگ ہمارے لیے ورثہ کے طور پر چھوڑ گئے ہیں وہ بھی منتخب ہوتے ہیں، کار کے الفاظ میں ''ہماری تصویر ہمارے لیے پہلے ہی منتخب اور متعین کر دی گئی ہے۔ یہ بیشتر اتفاقی طور پر نہیں ہوا ہے بلکہ یہ کام ان لوگوں نے کیا ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر مخصوص نظریہ سے متاثر تھے اور انہوں نے یہ سوچا کہ جن حقائق سے اس نظریہ کی حمایت ہوتی ہے وہ محفوظ کیئے جانے کے لائق ہیں۔ان ثبوتوں پر اعتماد کرنا اور حقائق کے بارے میں مطمئن ہو جانا بڑا دشوار ہے، کیونکہ تاریخ کے حقائق کبھی بھی ہم تک خالص نہیں پہونچتے ہیں کیونکہ وہ خالص شکل میں موجود ہی نہیں ہوتے بلکہ ہو بھی نہیں سکتے۔ یہ حقائق ہمیشہ ناقل کے ذہن سے چھن چھن کر آتے ہیں۔اسی روشنی میں کار (Carr) یہ نتائج نکالتا ہے:

''دستاویزات ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے جتنا ان دستاویزات کا مصنف ہمیں بتانا چاہے کہ کیا ہوا تھا۔اس کی فکر کے مطابق کیا چیز رونما ہونے کے لائق ہے یا رونما ہوگی۔ یا پھر اتنا ہی وہ چاہتا ہے کہ دوسرے بس یہی سوچیں یا پھر بس اتنا ہی کچھ جتنا وہ خود سوچتا ہے۔''

اس طرح انتخاب کے عمل کی دو سطحیں ہیں۔ایک تو اس عہد کا ناقل جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کون سا مواد نقل کرنے کے لائق ہے اور دوسرا معاصر مؤرخ جو اس انتخاب کو یہ فیصلہ کر کے مزید پختہ کر دیتا ہے کہ کون سا مواد پیش کرنے کے لائق ہے۔اس خیال کے مطابق ماضی کی ہمارے لیے دوسری تشکیل ہے۔

3.4.2 تہذیبی اضافیت Cultural Relativism

تہذیبی ماہر انسانیات کلفرڈ گیرز (Clifford Geertz) سے متاثر ہو کر آج کے تاریخی مفکرین نے یہ بحث چھیڑ دی کہ مؤرخین کی پیش کردہ ماضی کی تصویر خود ان کی سوسائٹیز کے خیالات، تصورات اور زبان میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قسم کے بیانیے یقینی طور پر مؤرخین کے تہذیبی تعصبات اور سماجی افکار سے متاثر ہوتے ہیں۔ چونکہ مختلف تہذیبیں دنیا کو مختلف انداز میں دیکھتی ہیں۔لہٰذا مختلف تہذیب سے وابستہ ایک مختلف سماج یا ماضی کا بیان معروضی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بیانات تہذیبی طور پر متعین ہوتے ہیں۔اس طرح سورج گرہن کو مختلف سوسائٹیز سے وابستہ لوگ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔اسی طرح ایک بادشاہ کی موت کی وجہ بدروحوں کو، بیماری یا اس کے دشمنوں کی سازش قرار دیا جا سکتا ہے۔ٹھیک اسی طرح مؤرخ کی تحریر کردہ تاریخ خود اس کے کلچر کے تصورات اور عقائد سے تشکیل پاتی ہے۔پال اے۔روتھ (Pal A. Roth) اسی خیال کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے ''یہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے کہ ایک جامد ماضی کی دنیا ہے جسے انتھک تحقیق کے ذریعہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مشورہ دیتا ہے کہ تاریخی صداقت کے تصور سے پیچھا چھڑانا ضروری ہے کیونکہ:

''ماضی کے واقعات صرف ان کے چند تاریخی سیاقوں پر منحصر ہیں، واقعات کی تاریخی حقیقت کا یہ تصور کہ ان واقعات کا پورا پس منظر موجود ہے جو انسانی قیاس آرائیوں اور درجہ بندیوں پر منحصر ہے، بالکل غیر مدلل ہے۔ایک ایسی دنیا کا وجود تو ہے جو ہماری بنائی ہوئی نہیں لیکن مخصوص واقعات میں اس کی تقسیم در تقسیم خالص ہمارا فعل ہے نا کہ نیچر کا۔''

IMC LIBRARY

تاہم گیرٹز (Greetz) نے ''کلچر کو قابل توجیہ علامات کے باہمی عمل کا نظام'' کا تصور نئے لسانی نظریات سے ہی اخذ کیا ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ تہذیب کو ''متنوں کے مجموعہ کے طور پر دیکھا جانا چاہئے جو کہ سماجی مواد سے تشکیل شدہ تخیلاتی عمل ہے چونکہ سماج کی تنظیم علامات سے ہوتی ہے....جن کے مفہوم.... ہمیں سمجھنے ہی ہوں گے اگر ہم اس تنظیم کو سمجھنا اور اس کے اصول متعین کرنا چاہتے ہیں۔'' اس طرح سماج اور تہذیب ایک متن ہیں جن کا مفہوم صرف مخصوص نشانیاتی کوڈ (Semiotic Codes) سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے سماج اور تہذیب کی اصل نوعیت (Textual Nature) کے پہلو پر مزید زور دیتے ہوئے دعویٰ کیا ''حقیقت بھی اتنی ہی تخیلاتی ہے جتنی تخیلاتی چیز'' اس قسم کے نظریاتی ڈھانچے میں حقیقت کا تصور اور تاریخ کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔ یورپ کے قرون وسطیٰ کے ایک مؤرخ گیبریل اسپیگل (Gabrielle Spiegel) تبصرہ کرتا ہے:

> اگر تخیلی حقیقت ہے اور حقیقت تخیلی اور ان کے درمیان فرق واضح کرنے کی کوئی علمیاتی بنیادیں نہیں ہیں، تو ایسی صورت حال میں ایک ایسا تشریحی نظام مراتب پیدا کرنا ناممکن ہے جو تاریخ اور لٹریچر، زندگی، فکر اور مواد اور مفہوم کے درمیان کوئی علمی تعلق پیدا کر سکے۔

3.4.3 لسانی اور مابعد جدید موڑ Linguistic and Postmodern Turn

اس روایت نے ماضی سے حقیقت ڈھونڈ نکالنے کے امکان کی انتہا پسندانہ تنقید کے مواقع فراہم کئے۔ اس نے حقیقت کے بجائے زبان کو سماجی مفہوم اور انسانی شعور کی تشکیل کرنے والا قرار دیا۔ یہ سب سوئس ماہر لسانیات فرڈینانڈ ڈی سوسیر (Ferdinand de Saussure) کے نظریے سے شروع ہوا جس نے ساختیاتی لسانیات کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے نظریات نے بہت سی دانشورانہ تحریکوں کو متاثر کیا۔ جیسے ساختیات (Structuralism)، نشانیات (Semiotics) اور مابعد ساختیات (Post Structuralism)

ساسیر نے اپنی کتاب *(Course in General Linguistics)* 1916ء جو ان کی موت کے بعد شائع ہوئی، زبان کے استشہادی تفاعل پر بڑے سخت سوالات اٹھائے۔ اس کے مطابق زبان کا ایک خود مختار نظام ہے اور کسی بھی زبان میں الفاظ جنھیں معنی نما بھی کہا جا سکتا ہے، تصورات سے متعلق ہوتے ہیں (جنھیں تصور معنی کہا جا سکتا ہے)، کسی ٹھوس شے سے نہیں۔ بالفاظ دیگر زبان دنیا کی حقیقی اشیاء سے متعلق نہیں ہوتی ہے، یہ دنیا کے مفہوم کو سمجھنے کا وسیلہ نہیں ہے اور زبان اور دنیا کے درمیان تعلق پوری طرح خود ساختہ ہے۔ ساسیر کے مطابق زبان، اپنے بل پر مفہوم کو جنم دیتی ہے اور انسانی افکار زبان کے ذریعہ ہی تشکیل پاتے ہیں۔

مشہور فرانسیسی ماہر لسانیات اور مفکر رونالڈ بارتھس (Ronald Barthes) نے بحث کو مزید آگے بڑھایا۔ اس کے مطابق، ماضی کی حقیقت کو ضبط تحریر میں لانے کا مؤرخین کا دعویٰ کاذب ہے۔ ان کی تحریر کردہ تاریخ ماضی کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ ماضی کا ایک نقش ہے۔ جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ماضی کے مشابہ ہے۔ اور یہ جھوٹی اطلاعات کو حقائق کے مجموعہ کے طور دکھاتی ہے۔ بارتھس کہتا ہے کہ مؤرخین جب ماضی کا بیان کرتے ہیں تو وہ بنیادی طور پر ماضی کے بارے میں متعدد تصورات کی بات کرتے ہیں نہ کہ ماضی کی۔ حقیقت کی بابت وہ کہتا ہے حقیقت کے دعوے کے ساتھ کسی بھی مخاطبے (discourse) کی طرح تاریخی مخاطبہ بھی اس عقیدے کا حامل ہوتا ہے جو صرف دو امور پر مبنی معنیاتی خاکہ مشارٌ الیہ اور معنی نما پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروضی تاریخ میں حقیقت کوئی چیز نہیں ہے، سوائے ایک غیر تشکیل شدہ تصور معنی کے جس نے مشارٌ الیہ کی قدرت کل کی پناہ لے رکھی ہے۔ یہ صورتحال اس چیز کو واضح کرتی ہے جسے ہم حقیقت کا اثر کہہ سکتے ہیں۔

بارتھس، معروضیت کو ایک ایسی چیز کی پیداوار قرار دیتا ہے جسے اشارہ جاتی التباس (Referential Illusion) کہا جا سکتا ہے۔ مؤرخین کے اس عقیدہ کے پیچھے یہی وہم کار فرما ہے کہ ایک ماضی کی دنیا موجود ہے جسے باریک بیں تحقیق کے ذریعہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ دراصل جس ماضی کے بارے میں مؤرخین بات کرتے ہیں وہ خود ان کی ہی تخلیق کردہ ہے۔ تاریخ نویسی کے پیشہ کے تیار کردہ سارے ساز و سامان، جیسے لفظی اقتباس، حاشیے، حوالے ......وغیرہ یہ سب ایک من گھڑت دنیا پیدا کرنے کے آلات ہیں تا کہ قارئین اسے حقیقی تصور کریں۔ بارتھس کہتا ہے کہ دراصل یہ سب کچھ حقیقت کے اثر

کو پیدا کرنے والے آلات ہیں جو قارئین کو مؤرخین کی تخلیق کردہ دنیا میں یقین کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

تاریخ نویسی کو سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ردتشکیل کے نظریہ (Theory of Deconstruction) کی طرف سے کرنا پڑا۔ یہ نظریہ جیکس دیریدا کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ اس نظریہ نے سرے سے اس امکان کو ہی مسترد کردیا کہ انسان اس لسانی نظام سے باہر رہ کر حقیقت کو سمجھ سکتا ہے جس کا وہ خود ایک حصہ ہے اور یہ کہ زبان کسی خارجی حقیقت کا حوالہ نہیں ہے بلکہ وہ بذات خود ایک نظام ہے جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ متن کا مفہوم طے کرنے میں بھی مصنف کا کوئی رول نہیں ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ زبان بذات خود اپنا کوئی منطقی اور استدلالی خاکہ نہیں رکھتی دیریدا زبان کو کسی مقررہ نظام کے بغیر من مانی علامتوں کا نظام قرار دیتا ہے اس طرح متن کئی مفہوم کا حامل ہوتا ہے جو ہر کسی کے ساتھ مختلف ہوسکتا ہے۔ دیریدا کہتا ہے کہ ''متن ابھی تک تحریر کا مکمل مجموعہ نہیں۔ کچھ مضامین کا کسی ایک کتاب میں یا اس کے حواشی میں احاطہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک مختلف نیٹ ورک، کسی چیز سے متعلق آثار کی بناوٹ اپنے سے زیادہ مختلف آثار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح متن اپنی مقررہ حدود سے بہت دور نکل جاتا ہے۔'' چنانچہ دیریدا نے ردتشکیل (Deconstruction) کے استعمال کی تجویز پیش کی تاکہ ایک متن میں پوشیدہ مفاہیم سے پردہ اٹھایا جاسکے، تاہم ردتشکیل حتمی طور پر متن سے کوئی مفہوم سامنے نہیں لاسکتی۔ یہ صرف یہ واضح کردیتی ہے کہ زبان اپنی حدود کے باہر کسی حقیقت کے بارے میں بتانے سے عاجز ہے۔ دیریدا کی مشکل نثر میں اس عمل کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔ ضمیموں کی اس ترتیب سے ایک لامحدود سلسلہ نکل آتا ہے۔ پھر ان ضمنی چیزوں کو خاص انداز میں ضرب دینے سے بہت ساری ایسی چیزوں کا شعور پیدا ہوجاتا ہے جو التوا میں ڈال دیتا ہے: چیزوں کو، ان کی فوری موجودگی کو، حقیقی ادراک کا سراب۔

قرون وسطیٰ کے ایک دوسرے مؤرخ گبریل اسپیگیل (Gabrielle Spiegel) نے ناقدانہ طور پر دیریدا کے نظریہ کو آسان زبان میں بیان کیا ہے:

''متن کی زبان کے پیچھے اور زیادہ متن پوشیدہ ہوتا ہے، ایک لامحدود مراجعت کی صورت میں جس میں حقیقت اور مادے کی موجودگی ہمیشہ التوا میں رہتی ہے، ناممکن الحصول، ردتشکیل کے مطابق ہم زبان کے قیدخانے میں قید ہیں جس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ (زبان کا قیدخانہ فیشن پرست نٹشے کے حامیوں کا محاورہ ہے)۔''

اگر زبان کسی خارجی حقیقت سے متعلق ہو ہی نہیں سکتی اور زبان کے کوئی متعینہ معنی نہیں ہیں، اگر متن میں بے شمار مفہوم پوشیدہ ہوتے ہیں تو معروضی انداز میں تاریخ نویسی کیسے ممکن ہے؟ مختصراً یہ کہ ردتشکیل کے حامی (Deconstrcutionist) سب کچھ پلٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ رچرڈ ایونس (Rechard Evans) نے اشارہ کیا ہے۔

''وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مصنفین جو کچھ تحریر کرتے ہیں اس کے مفہوم پر ضبط و قابو رکھنے میں وہ ناکام ہیں، معنی خیزی کی یہی لامحدودیت زبان کو تشکیل دیتی ہے۔ ایک متن کو جب بھی پڑھا جائے اس کا مفہوم بدل جاتا ہے کیونکہ مفہوم کا تعین قارئین کرتے ہیں اور اصولاً سارے مفہوم یکساں طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ تاریخ کا ماضی میں مفہوم نہیں پایا جاسکتا ہے۔ مفہوم کا تعین اکثر و بیشتر مختلف مؤرخین نے ہمیشہ مختلف انداز میں کیا ہے جو کہ یکساں طور پر صحیح ہیں، تاریخ کے متن اور مؤرخین کے متن کے درمیان کوئی لازمی رشتہ نہیں ہے۔ ماضی کے تعلق سے موجود متن اپنے مفہوم کے اعتبار سے اتنا ہی خودساختہ ہے جتنا کہ دیگر متن۔''

دیگر مؤرخین نے بھی مفہوم کی تحلیل کے تعلق سے اپنے اندیشے ظاہر کیے ہیں۔ لارنس اسٹون (Lawrance Stone) تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے ''اگر متن سے باہر کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں جس تاریخ کو ہم جانتے ہیں اس کی عمارت ہی ڈھہہ جائی گی۔ اور حقیقت اور افسانہ ایک دوسرے سے خلط ملط ہوجاتے ہیں۔ گبریل اسپیگیل نے اپنی تشویش ان الفاظ میں ظاہر کی ہے کہ اگر متن جیسا کہ دستاویزات، لٹریری کام وغیرہ، صاف و شفاف انداز میں حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے ہیں بلکہ صرف دوسرے متون پر دلالت کرتے ہیں تو ایسی صورت میں تاریخی مطالعہ کو شاذ و نادر ہی لٹریری مطالعہ

سے الگ قرار دیا جاسکتا ہے اور ماضی پوری طرح لٹریچر میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

تاریخ کے فلسفی لوئس مینک (Louis Mink) اور امریکی مؤرخ اور نظریہ ساز ہیڈن وہائٹ (Hayden White) نے جو کچھ ثابت کیا تھا اس تناظر میں یہ تشویش غلط بھی نہیں ہے۔ مینک نے تاریخ نویسی میں اندرونی تضاد کی بات بھی کہی ہے وہ کہتا ہے:

''تاریخی بیانیے کے بارے میں ہم الجھن کے شکار ہیں کیونکہ تاریخ ماضی کی کسی حقیقی گتھی کو واضح کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مگر بطور بیانیہ یہ تخیلاتی تشکیل کی پیداوار ہے جو کہ حقیقی ہونے کے اپنے دعویٰ کا دفاع کسی قابلِ قبول دلیل یا سند سے نہیں کر سکتی۔''

ہیڈن وہائٹ اس سے کہیں زیادہ انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخی بیانیہ کے بارے میں حقیقی ہونے کا کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا جاسکتا اور اس کو افسانہ کی ایک شکل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ بہت ساری کتابوں اور مضامین میں بھی وہائٹ نے دعویٰ کیا ہے کہ تاریخ اور افسانہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کی رائے میں تاریخی تحریریں لفظی افسانے (Verbal Fiction) ہیں اور تاریخ اور لٹریچر کے مشمولات کی بنیاد اور ان کی شکلیں سب کچھ ایجاد کردہ ہیں، سائنس کے مقابلے میں۔ مابعد جدیدیت بھی اس خیال سے پوری طرح متفق ہے۔ اس نظریہ کے مطابق جدید تاریخ نویسی غیر جانبدار ہو کر بھی مغربی سامراجیت کی توسیع سے پوری طرح وابستہ ہے۔ اس نے دوسری اقوام اور تہذیبوں پر جدید یوروپ کی افضلیت کے تصور کو ہی ثابت کیا ہے چنانچہ معروضیت اور غیر جانبداری کے اس کے دعوے مشکوک ہیں۔

3.5 مؤرخین کی تشویش — Historian's Concern

ماضی قریب میں بہت سے مؤرخین معروضیت کے حصول کے امکان سے مکمل انکار کے بارے میں اپنی تشویش ظاہر کرنے لگے ہیں۔ برطانوی۔ امریکی مؤرخ لارنس اسٹون (Lawrance Stone) نے اس رجحان کو واضح طور پر یوں بیان کیا ہے۔

''پچھلے پچیس برسوں کے دوران تاریخ کے نفس مضمون (واقعات، رویے) اور مسائل (جو وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلی کی وضاحت ہے) کے تعلق سے تشویشناک سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ بالخصوص فرانس اور امریکہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس انداز میں ہو رہا ہے، کے ذیل میں خود اعتمادی کی کمی کا اثر اس پیشہ پر بھی پڑا ہے۔''

اسٹون کے مطابق تاریخی پیشہ کو یہ خطرات تین مختلف وسیلوں کی جانب سے لاحق ہوئے ہیں۔ ردِ تشکیل کا نظریہ جسے جیکس دریدا نے ترقی دی، تہذیبی بشریات (Cultural Anthropology) یہ نظریہ کلفیورڈ گیرٹز (Clifford Geertz) نے پیش کیا اور نئی تاریخیت (New Historicism)

ایک دوسرے مورخ گیبرئیل اسپیگل نے بھی اس رجحان کے بڑھنے پر تشویش ظاہر کی۔ اس نے پورے عمل کو اس طرح بیان کیا ہے:

''........تاریخی اور لٹریری مطالعہ کو جو مقبولیت حاصل تھی انیسویں صدی کے بعد وہ برقرار رہ نہ سکی۔ پُر اعتماد، انسانیاتی (Humanist) عقیدہ کہ ماضی کی عقلی اور معروضی چھان بین سے ہم تاریخی متون میں مستند مفہوم دریافت کر سکتے ہیں، نئے نظریے کے حامل مابعد جدید (Postmodernst) تنقیدی مباحث میں اس پر تابڑ توڑ حملے ہوئے۔ اس مباحثہ میں بہت سارے وہ تصورات بھی حملہ کی زد میں آئے جنہیں مؤرخین نے روایتی طور پر ماضی کو سمجھنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے دوران پیش کیا تھا۔ ان میں علت و معلول کا سلسلہ (Causality)، تبدیلی (Change)، تصنیفی مقصد (Authorial Intent)، مفہوم کا استحکام، انسانی ایجنسی اور سماجی تعین شامل ہیں۔

اس مشاہدہ کی بنیاد پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک مؤرخ کے نقطۂ نظر سے اس موجودہ تنقیدی ماحول کو دیکھ کر عام تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ تاریخ کو منسوخ

قرار دیا جائے اور حقیقت سے فرار اختیار کر کے زبان کو ہی انسانی شعور کا تعمیری ایجنٹ اور مفہوم کی سماجی پیداوار قرار دیا جائے۔

یہ تشویش بیجا نہیں ہیں، مابعد جدیدیت پسند بھی اسی نہج پر سوچتے ہیں کہ ان کے نظریات تاریخ کو پژمردہ کردیں گے۔ کیتھ جینکس (Keith Jenkins) مابعد جدیدیت پسند مفکر نے اعلیٰ اور ادنیٰ تاریخوں (Upper and Lower Case Histories) کی موت کا اعلان کردیا وہ کہتا ہے کہ تاریخ اب محض الفاظ وکلمات کی دنیا کے بارے میں بے بنیاد صرف الفاظ وکلمات کی صورت نظر آتی ہے۔

اس سے قبل پیٹر نووک (Peter Novick) نے اپنی مشہور کتاب میں یہی نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا ''جب دانشوروں کی برادری مشترکہ ہدف، مشترکہ معیار، مشترکہ مقاصد کے تحت متحد ہو جائے گی تو تاریخ کا شعبہ بند ہو جائے گا۔''

اسی خیال کے ایک دوسرے حامی پیٹرک جوئس (Petrick Joyce) نے بھی تاریخ کے خاتمہ کا دعویٰ کر دیا۔ کیونکہ سماجی تاریخ جدت پسندی (Modernity) کا ابتدائی مرحلہ ہے جو دنیا کے نام رکھنے کے عمل میں یقین نہیں رکھتی بلکہ اپنے سیاسی اور عملی نظریہ کے مطابق اسے جنم دیتی ہے۔

ہندوستانی تاریخ میں بھی یہ تشویش مسلسل طور پر موجود ہے۔ بہت سے مؤرخین نے نچلے درجے کے مطالعوں میں مابعد جدیدیت کی طرف جھکاؤ کے خلاف ردعمل ظاہر کیا ہے۔ جن میں سمیت سرکار، روسالنڈو ہینلون (Rosalindo' Hanlon)، سی۔اے بیلی (C.A.Bayly)، رنجیت داس گپتا اور ڈیوڈ واش بروک قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ہندوستانی مطالعات میں کلچرل ازم اور اضافیت کی طرف رخ کرنے پر سوال کھڑے کئے۔ اس بارے میں تفصیلی بحث اکائی 25 میں کی جائے گی۔ ایک بار پھر دہراتے ہوئے اس سیکشن کو یہیں ختم کیا جاتا ہے کہ جہاں تک تاریخ کے فلسفہ کی بات ہے تو مابعد جدیدیت پسندی کی دخل اندازی سے طویل مدت سے قائم تصورات بکھر کر رہ گئے۔

3.6 معروضیت کا امکان Possibility of Objectivity

معروضیت کے امکان پر انتہا پسندانہ تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا کر ایک شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ آیا کسی بھی قسم کی معروضیت کو قائم کرنا ممکن ہے۔ آیا ماضی یا مختلف معاشروں اور تہذیبوں کو سمجھنا ممکن ہے۔ یہ تنقیدیں ہمیں بتاتی ہیں کہ صداقت کا عام مطابقتی نظریہ بہت زیادہ قابل بھروسہ نہیں ہے۔ دنیا کے بارے میں ہماری معلومات ہمارے موجودہ سروکار نظریاتی کمٹمنٹ، تہذیبی ماحول اور علمی فضا کے توسط سے ممکن ہی نہیں، مؤرخین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ذرائع بالکل یقینی نہیں ہیں۔ وہ داخلیت کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں جو کبھی کبھی نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ اور ہمارے تنقیدی اندازوں کے باوجود ہمیشہ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ذرائع کے اندر موجود جانبداری کو دور کر سکیں۔ اسی طرح ہماری شعوری کوششوں کے باوجود بطور مؤرخ کے اپنے افکار میں رچے بسے تہذیبی تعصب کو دور کر پانا بھی اکثر وبیشتر دشوار ہوتا ہے۔ اکثر مؤرخین اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ماضی کی ایک مکمل تصویر کا حصول ناممکن ہے۔ ذرائع مختلف ہیں اور ان کی تعبیریں بھی متعدد ہیں، ایسی صورتحال میں ماضی کی مکمل نمائندگی کا کوئی بھی دعویٰ ایک کھوکھلا دعویٰ ثابت ہوگا۔

تاہم معروضیت کے امکان سے مکمل انکار معاملہ کو ایک دوسری انتہا کی جانب لے جانے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'مکمل معروضیت ممکن نہیں ہے' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معروضیت ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا معروضیت کی تلاش ہی عبث ہے، حالانکہ ماضی کی مکمل حقیقت کے بارے میں بتا پانا ممکن نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جزوی حقیقت کا بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ اضافی موقف (Relativist Position) کے ایک ناقد نوویل کیرول (Novel Carroll) نے نشاندہی کی ہے۔

''تاریخی بیانیے ایجادات ہیں، یعنی انہیں مؤرخین نے ترتیب دیا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکلے کہ یہ گھڑے ہوئے ہیں (اور اسی لیے افسانوی ہیں)''

وہ اس نکتہ پر مزید زور دیتے ہوئے کہتا ہے؛

MEDIA CENTRE IMC LIBRARY Hyderabad

".....بیانیے نمائندگی کی ایک شکل ہیں اور اس تناظر میں یہ ایجاد کردہ ہیں، لیکن اس سے صحیح صحیح معلومات فراہم کرنے کی ان کی صلاحیت ختم نہیں ہو جاتی ہے، بیانیے ماضی کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر سکتے ہیں مگر معلومات فراہم کرنے کا انداز مخصوص ہے۔ یہ واقعات کے پورے اجزائے ترکیبی یعنی طرز واقعات بیان کر دیتے ہیں جس میں پس منظر، اسباب واثرات، سماجی سیاق وسباق، حالات کی منطق، عملی افکار اور اعمال کے نتائج شامل ہیں۔"

کیرول (Carroll) نے اس خیال کے لیے ہیڈن (Hyden) اور دیگر مؤرخین کی بھی تنقید کی ہے کہ یہ لوگ یقین کرتے ہیں کہ ماضی کی شفاف تصویر ہی تاریخی بیانیے کے لیے حقیقت کی شرط کو پورا کر سکتی ہے، اگر ماضی کی ایسی شفاف تصویر فراہم کرنے میں ناکامی ہو جائے تو یہ افسانہ کی سطح پر آ جائے گی ،لہٰذا یا تو شفاف تصویر ہے یا پھر افسانہ ہے، ان دونوں کے درمیان کوئی چیز نہیں ہے۔ بہت سے مؤرخین نے اس خیال کے خلاف ردعمل ظاہر کیا ہے اور ایک درمیانی راہ نکالنے کی اپیل کی ہے جسے برائن فے (Brian Fay) نے جدلیاتی مڈل گراؤنڈ کہا ہے جو کہ ہر رجحان کی بصیرتوں کو محفوظ رکھتی ہے اور اس کی بے اعتدالیوں کو چھانٹ کر الگ کر دیتی ہے۔

Summary — 3.7 تلخیص

مغربی دنیا میں قدیم زمانے سے ہی معروضیت کے اصولوں نے تاریخ نویسی کی بنیاد فراہم کی ہے کہ انسانی موضوعیت سے پرے ایک ماضی کی دنیا بھی ہے۔ یہی خیال اسے دریافت کرنے کی کوششوں کا موجب بنا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جرمن مؤرخ ویلم رینکے کی جدوجہد نے اس خیال کو ٹھوس بنیاد فراہم کی ۔ مؤرخین کی کئی نسلوں نے رینکے کا اتباع کیا اور معروضی اور تجربی تاریخیں لکھیں۔ تاریخی پیشہ میں یہ روایت آج بھی بڑے پیمانے پر قابل قبول ہے ۔ تاہم اس روایت کی خوب تنقید بھی کی گئی۔ سب سے اہم تنقید نے اس نکتہ پر توجہ مبذول کرائی کہ مؤرخین اپنے آپ کو مکمل طور پر نظریاتی اور تہذیبی تعصبات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے مزید یہ کہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ ماضی کی حقیقت کی دریافت ناممکن ہے کیونکہ ذرائع بھی تعصب سے خالی نہیں ہیں۔ دوسری قسم کی تنقید نے اس امر پر زور دیا کہ دنیا کے بارے میں ہماری معلومات مکمل طور پر زبان کے توسط سے ہے جو کہ مؤرخین یا دوسرے لوگ بولتے چالتے ہیں اور لکھتے پڑھتے ہیں۔ اس طرح لسانی نمائندگی سے پرے کوئی دنیا نہیں ہے۔ چنانچہ کسی قسم کی معروضیت کو قائم رکھنا ناممکن ہے۔ یہ تنقیدیں کبھی کبھی تاریخ نویسی کی اہم بنیاد پر ہی سوال کھڑا کر دیتی ہیں، تاہم اکثر عملی مؤرخین نے مکمل معروضیت اور اس کے مکمل انکار کے درمیان بیچ کی راہ نکالی ہے۔

Exercises — 3.8 مشقیں

1. معروضیت کیا ہے؟ تاریخ نویسی کی ان روایات سے بحث کیجیے جنھوں نے معروضی اصول کو بنیاد بنایا۔
2. مؤرخین نے معروضیت کے اصول پر اتنی تنقید کیوں کی؟ تاریخ نویسی میں معروضیت ممکن ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے
3. تاریخ میں معروضیت کے اولین ناقدین کون تھے؟ ان کے دلائل کیا ہیں؟ آپ ان سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں۔
4. مندرجہ ذیل عنوانات پر نوٹس لکھیے۔

   (a) تہذیبی اضافیت (Cultural Realtivism)

   (b) لسانی موڑ (Lingustic Turn)

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE
Acc. No. MA-044
Date 03.08.2015
HYDERABAD

Suggested Readings — 3.9 مجوزہ کتابیں

C.Behan McCullagh, *The Truth of History* (London, New York, Routledge, 1998).

C.Behan McCullagh, *The Logic of History* (London, New York, Routledge, 2004).

Richard J. Evans, *In Defence of History* (Granta Books, London, 1977).

Brian Fay, Philip Pomper and Richard T. Vann (eds.) ,*History and Theory : Contemporary Readings* (Mass. and Oxford, Blackwell, 199).

Keith Jenkins (ed.), *The Postmodern History Reader* (London,and New York, Routledge, 1997).

Steven Best and Douglas Kellner, *Postmodern Theory : Critical Interrogations* (London, MacMillan, 1997)

Georg G. Iggers, *Historiography in the Twentieth Century : From Scientfic Objectivity to the Postmodern Challange* (Hanover and London, Wesleyan University Press, 1997).

Stephen Davies, *Empiricism and History* (New York, Palgrave, 2003).

Geoffrey Roberts (ed.), *The History and Narrative Reader* (London and New York, Routledge, 2001).

Arthur Marwick, *The Nature of History* (Third Edition, New York, 1989).

MEDIA CENTRE LIBRARY
MA-044
03.08.2015
HYDERABAD

اکائی 4 تاریخ،نظریہ اور سماج
History , Ideology and Society

structure

ساخت

Introduction	تعارف	4.1
Ideology in History	تاریخ میں نظریہ	4.2
Meaning of ideology	نظریے کے معنی	4.3
Some later writers	بعد کے کچھ مصنفین	4.4
Summary	خلاصہ	4.5
Exercises	مشقیں	4.6
Suggested Readings	مجوزہ کتابیں	4.7

Introduction — 4.1 تعارف

ایک نظریہ نقاط نظر (Views) کے نظام، عقائد (Beliefs) اور تصورات وخیالات (Ideas) پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ سماجی واقتصادی تشکیل میں (اس کی سیاسی نوعیت Position اور روابستگیوں کے ساتھ) اس کے جواز کے لیے کچھ قابل قبول معیارات (Norms)، تہذیبی ترجیحات، یا سماج اور انسانی زندگی کی نظری فہم (Theoretical Understanding) کے طور پر تصدیق کر کے معاونت کرتا ہے۔ لازمی طور پر ایک نظریاتی موقف (Position) کی وسعت (Scope) وسیع انسانی سماجی حدوں، اقتصادی رشتوں، اخلاقی اصول، مذہبی عقائد، جمالیاتی قدردانی، فلسفیانہ خیالات اور سیاسی فیصلے سے متعلق ان کے انتخاب پسند (Choice) پر محیط ہوتی ہے۔ معاونت کے اس معاملے کو صرف موجود حالت (Statusquo) کی ترویج کے طور پر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک نظریہ ایک ایسے سماجی نظام کی معاونت کرتا ہے جسے حقیقی معنی میں ابھی نمودار ہونا ہے۔ دراصل سماجی نظام میں بڑی تبدیلی لانے کے لیے کوئی بھی تخیلاتی امنگ (Visionary Aspiration) ایک موزوں نظریاتی (Ideological Thrust) مقصد کی اساس فراہم کرسکتی ہے۔ اس طرح ایک نظریہ قدامت پرست یا انتہا پسند یا ان متضاد رجحانات سے مرکب ہوسکتا ہے۔ اس طرح تاریخ میں ایک ہی معاشرے میں متصادم نظریات کی مثالیں بہت ہیں جن میں سے کچھ موجودہ صورت کو برقرار رکھنے کے لیے پرعزم ہیں جب کہ دوسرے اصلاح کی طرف بلکہ اشیاء کے مروجہ نظام کو بدلنے کے لیے انقلابی سماجی تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ نظریات تاریخ کی بصیرتوں (Visions) کے حامل ہوتے ہیں اور انہیں قائم رکھتے ہیں اور تاریخ کی تشریح ووضاحت میں خاص میلان طبع کو پیدا کرتے ہیں۔

Ideology in History — 4.2 تاریخ میں نظریہ

تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ مستقبل کو ابھی ہونا ہے۔ یہ اصلیت میں جب ہوتا ہے جب اس میں دلچسپی لینے والے لوگ اپنی حال اور ماضی کی فہم کے مطابق اس پر غور کرتے ہیں۔ مختلف لوگوں اور گروہوں کی یہ فہم بالکل مختلف نوعیّتوں کی ہوسکتی ہے۔ زمانہ حال اور زمانہ ماضی ممکن ہے دونوں زمانہ مستقبل میں موجود ہوں۔ کسی بھی تاریخی عمل میں کوئی انسانی معاشرہ صرف شواہد کی بنیاد پر اس بات سے پوری طرح باخبر نہیں ہوسکتا کہ حقیقت میں کیا ہوا اسے اس ادراک کی ضرورت ہوتی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے اور جو معلوم کو نامعلوم سے الگ کرسکے۔

C.Behan Mc
Richard J. E
Brian Fay, P
Readings (M
Keith Jenkins
Steven Best
MacMillan, 1
Georg G. Igg
Postmodern (
Stephen Davi
Geoffrey Rob
2001).
Arthur Marwi

نظریاتی عناصر تاریخی معاملے میں ان تمام ابعاد کے امتزاج میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس نقطے کی وضاحت کے لیے قدیم یونان سے ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔تھوسی ڈائڈیس (Thucydides) چوتھی پانچویں صدی قبل مسیح کے ایتھنز کے ایک شہری نے پیلوپونیشین (Peloponnesian) جنگ کی ایک تاریخ لکھی۔ یہ جنگ ایتھنز اور اسپارٹ کے بیچ ہوئی تھی۔ایتھنز ایک جمہوری ریاست تھی (لیکن وہاں غلام تمام حقوق سے محروم تھے اور ریاست غلاموں سے بھری ہوئی تھی) اور 6 صدی ق م سے وہاں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ جمہوری ترقی ہوئی، جہاز رانی میں توسیع اور بحری طاقت میں اضافہ ہوا۔ مزید برآں بڑھتی ہوئی تجارت اور بحری برتری نے ایک ایتھینین سلطنت کی نشو ونما اور ترقی کی راہ ہموار کی۔ان تمام وجوہات کی بنا پر اہل ایتھنز کی فکر وحیات کے رویوں میں تبدیلی پیدا ہوئی۔اس کے برخلاف اسپارٹا میں اولی غارکیہ (Oligarchic) حکومت تھی اور وہ اقتصادی عمل اور طرز معاشرت اور ان کی پابندیوں اور اشاعت میں انتہا درجہ کی قدامت پسند تھی۔

حالانکہ تھوسی ڈائڈیس ایک ایتھینین تھا لیکن وہ جمہوریت کا مخالف اور ایتھنیس میں پرانی زنجیروں کو توڑ کر تبدیلیاں پیدا کرنے کا ذرا بھی حامی نہیں تھا۔ پیلو پونیشین جنگ میں تھوسی ڈائڈیس نے بہت سے مقامات پر ایسی توضیح اور تبصرہ کیا ہے جس سے اس کی اولی غارکیہ سے ہمدردیاں نمایاں ہوتی ہیں۔اس نے اس موضوع کا اس زوایہ سے محاکمہ کیا جس کا نتیجہ 404 ق م میں اتھنز کی شکست تھا جب کہ اس نتیجے کو جمہوری نظام کی کمزوری کے طور پر بھی ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ وقوعوں کے حقیقی روپ نے بعد کے زمانے میں مختلف سمتیں اختیار کیں۔ یہاں تک کہ بہت ہی کم فوجی طاقت کے ساتھ ایتھنیس جمہوریت پسندوں نے دوبارہ حملہ کیا اور اولی غارکیہ قوتوں کو شکست دی جس میں اس وقت اتھینز میں تعینات اسپارٹا کی فوج کی مدد شامل رہی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت پسندوں اور اولیہ غارکیوں کے بیچ مفادات کے ٹکراؤ میں مختلف قسم کے اقتصادی مفادات شامل تھے۔کل ملا کر کسی بھی طرح کے اخلاقی اصولوں کا اثر ورسوخ مختلف عقائد اور تہذیبی ترجیحات کے ذریعے پیدا ہونے والے نقاط نظر کے تصادم میں یونانی تاریخ میں خاطر خواہ طور پر تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں تھوسی ڈائڈیس کی تحریر کردہ تاریخ میں نظریاتی مفہوم کا ایک عنصر ملتا ہے۔

عہد وسطیٰ کی اصطلاح ایک آسان لیبل ہے جو یوروپ میں اس کے جدید عہد سے یونانی رومی عہد عتیق کو جدا کرنے کے لیے اس مدت کی علامت ہے۔ تاریخ کا یہ مرحلہ جاگیردارانہ سماج اور معاشیات کی خصوصیات سے متصف ہے۔ جاگیرداروں کے حفظ مراتب، ان کی مختلف سطحیں، چرچ اور اس کا پادریانہ انتظام والنصرام، اور محنت کش کسان جو زرعی غلام تھے، بادشاہ، اشرافیہ اور پادریوں کی مخصوص خدمات کے لیے ان کی ضرورت تھی اور وہ ان کے احسان مند ہوتے تھے۔حیثیت اور قانونی مرتبہ کے مطابق لوگوں کے درمیان مثالی تفریق سماجی درجے کے طور پر جانی جاتی تھی جیسے اشرافیہ جو اعلیٰ مرتبے کے حامل تھے، کسان، کاریگر، تاجر ادنیٰ درجے کے۔اس سماج میں کسان مزدوروں کی بڑی تعداد غلام کے نام سے جانی جاتی تھی۔ مالک سے زمین کے الاٹ مینٹ کے لیے زرعی غلاموں کو مالک کی زمین پر بغیر معاوضے کے کام کرنا پڑتا تھا اس لحاظ سے یہ بندوبست کرایہ مزدوری پر منحصر تھا۔ جاگیردارانہ نظام نے وقتاً فوقتاً کرائے کی ادائیگی کے لیے مختلف صورتیں قائم کیں (جیسے مزدوری، رقم، پیسہ)

یہ اپنے آپ میں کشادگی اور اصلاحات کا حرکیاتی مرحلہ تھا (12-10 صدی)۔ آخرکار بورژوادی زیادہ سے زیادہ خودمختار پیداواری اکائیوں کو وجود میں لانے اور تجارت کے فروغ کے رجحانات کے ساتھ طلوع ہوئے جن کی وجہ سے جاگیردارانہ نظام بیٹھ گیا۔ جاگیرداریت کے خاتمے میں کسانوں کی بغاوت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

جاگیردارانہ نظام اپنے تحفظ اور جواز کے لیے ایک نظریہ رکھتا تھا۔تصورات اور عقائد کا ایک نظام حکمراں قوتوں کے اعمال وافعال اور ان کے مفادات کو عظمت بخشنے کے لیے معرض وجود میں آیا۔مثال کے طور پر جاگیردارانہ سپاہیوں میں جانبازی (Chivalry) کا تصور کمزوروں کی محافظت اور عیسائی عقائد کے تحفظ سے جڑا ہوا تھا اس کے علاوہ اور کوئی غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر یا فہم قرون وسطیٰ کے فوجی کارکنوں میں نہیں تھی۔ دراصل عہد وسطیٰ کے نظریاتی مشتملات خدا کے تصور سے ماخوذ تھے جو زندگی اور انسانی تاریخ کے نظام کو چلانے والا اور ماورائے دنیا ہے۔انسانی تقدیر لازمی طور پر خدا کی مرضی سے طے ہوتی ہے۔خدا پر اس طرح یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے تاریخ کے معنیٰ شہنشاہوں کی بے ثبات عظمت نہیں ہے بلکہ بعد کی دنیا میں نجات یا سزا وجزا کی فکر ہے۔

کارل مین ہائم (Karl Mannheim) نے اس طرح کی دوسری دنیا کے معنی خیز پہلو کو بیان کیا ہے کہ پادریانہ اور جاگیردارانہ قرون وسطیٰ کا نظام

اپنی جنت کو معاشرہ کے باہر تعمیر کرنے کا اہل ہوا، اس دوسری دنیا کے کمرے میں جس نے تاریخ کو ماورائی بنا دیا اور اس کی انقلابی طرز کو کند۔ جنت کا تصور قرون وسطیٰ کے معاشرہ کا ایک جزو لاینفک تھا۔ جب خاص سماجی گروہوں نے اپنے پیکر آرزو کو اپنی حقیقی زندگی میں مجسم کیا اور ان کو حقیقت بنانے کی کوشش کی اس وقت یہ تمام نظریات خیالی ہو گئے۔(Ideology ond Utopia, ch.iv)

یوروپ کا بیشتر حصہ بالخصوص مغربی ممالک میں قرون وسطیٰ پر سرمایہ داریت کے آغاز اور اس کے ارتقا نے سبقت حاصل کی۔ یہ ایک تاریخی تغیر تھا جو چار صدیوں تک جاری رہا، جس کی نمایاں خصوصیات بے مثال سائنسی ترقی، اور مادی پیداوار میں تشکیلی و تکنیکی تبدیلیاں تھیں۔

جہاں تک انسانی خیالات اور اقدار میں نظری فرائض(Corresponding charges) کی بات ہے تو ہمیں مذہبی تحریک رفارمیشن (16 ویں صدی) جو جرمنی میں شروع ہوئی اور نشاۃ ثانیہ، جس کا آغاز اٹلی سے ہوا اور اس کے بعد ایلزابیتھین انگلینڈ پر غور کرنا چاہیے۔ نشاۃ ثانیہ کے فلسفیانہ خیالات کی نمایاں خصوصیات انسان دوست تہذیب اور اہم سلسلہ وار سائنسی ایجادات ہیں۔ انسان دوستی نے فرد کی آزادی پر حد درجہ زور دیا۔ مذہبی رہبانیت کی مخالفت کی اور انسان کی مادی خواہشوں اور ضرورتوں کی تسکین اور لذت اندوزی کی وکالت کی۔ پٹرارک (Petararch)، دانتے (Dante)، بوکا سیو (Boccaccio)، لیونا ردداونچی (Leonardo da vinci)، برنو (Burno)، کاپرنیکس (Copernicus)، شیکسپیر (Shakespeare)، فرانس بیکن (Francis Bacon) نمائندہ انسان دوست ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے مفہوم میں انسان دوستی نے ان تمام نقاط نظر کی توثیق کر کے جن سے اس کی حیثیت کی اشاعت ہوتی تھی، خدا کے تصور کو قبول کیا۔ اس نوع کی انسان دوستی کا منفی پہلو یہ تھا کہ یہ مزدوروں اور آلام ومصائب کے مسائل سے بہت دور تھی۔ اس طرح اس طبقے کے سیاق میں، اس زمانے کے ابھرتے ہوئے بورژوؤں کے لیے یہ ایک اچھا نظریہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح مذہبی ریفارمیشن (Reformation) کی تحریک بھی جانب دار تھی۔ اس نے کیتھولک اور پاپائی اصولوں کی کمیوں کو ظاہر کرتے ہوئے جمہوری قومی ریاستوں کی نمود میں مدد کی۔ ایک اہم اسکالر اور ریفارمیشن تحریک کے اولین لیڈر مارٹن لوتھر (Martinluther)(403-1536) نے اس بات کو رد کیا کہ چرچ اور پادریانہ نظام انسان اور خدا کے درمیان ایک ثالث کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ جرمن برگرس کے مادی مفادات کے حصول کے تئیں کبھی مثبت نہیں رہا۔ نہ ہی اس نے ابتدائی برگرس کی مدد کی، نہ ہی اس نے ابتدائی بورژوا انسان دوستی کے تصورات کو تقویت بخشی۔ لوتھر نے کسانوں کی جنگ (1525) کے دوران حکمراں طاقتوں کی مدد کی۔ مارکس نے اس تعلق سے بڑا اہم تبصرہ کیا ہے۔ کہ لوتھر نے ایقان (convicton) پر مبنی متبادل غلامی کے ذریعہ خدائی عقیدے پر مبنی غلامی پر فتح حاصل کر لی۔

جان کیلون (Jhon calvin)(1509-1546) کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ وہ یہ مانتا تھا کہ خدا کو پکارنے والا گناہ گار شخص رحم خداوندی کے لیے اپنی اہمیت ثابت کرتا ہے، اس کے سوانجات کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیلون (Calvin) نے انسان اور خدا کے درمیان پادریانہ ثالثی کی اہمیت وافادیت کو بھی رد کیا۔ اس کے مطابق اس دنیا میں کام کی کیفیت وکمیت کی جڑیں ہی صرف انسانی نجات ہیں۔ صرفے پر قابو ایک خصوصیت ہے جو جمع آوری میں مدد کرتی ہے۔ اس طرح ریفارمیشن کالونسٹ (Calvinist) اخلاقیات تاریخ میں سرمایہ داری کی ضرورتوں کے مطابق تھی۔ میکس ویبر (1864-1930) مشہور جرمن ماہر سماجیات جو پروٹسٹنٹ اور سرمایہ دارانہ اخلاقیات کے مطالعے سے ممتاز ہوا، اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ رہبانیت کی ترقی اور اس کا کردار مجموعی سماجی صورت حال خصوصاً معیشت سے متاثر تھے۔ عام طور پر جدید انسان اپنے مصمم ادارے کے ساتھ تہذیب اور قومی کردار کو مذہبی معنویت بخشنے کا اہل نہیں ہے، جس کے وہ لائق ہے۔ لیکن یقیناً میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مادیت یا اس کے متوازی یک رخی روحانی علی تعبیر پیش کی جائے۔(The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism;ch.v) اقتصادی، مذہبی اور قومی تہذیبی حلقۂ اثر کے مابین عمل ورد عمل کی ان تشکیلات کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ تاریخ کے عمل میں شامل لوگوں کی نظریاتی کھینچا تانی سے متعلق ہے۔

اقتصادی انفرادیت پسندی اور عدم مداخلت کا نشو نما مذہب، ریاست اور شہری سماج کے مابین متوازن رشتوں کے قیام کا باعث تھا۔ نئی لیڈرشپ کا بنیادی مقصد سرمایہ دارانہ تغیر اور اس کے سماجی مقاصد کی حصولیابی کے لیے پرائیویٹ ملکیت اور اس کے استعمالات کو جاگیردارانہ نظام اور اس کے پادریانہ اختیارات کی سیاسی اور مذہبی پابندیوں سے جو چرچ کے زیر انتظام تھی آزاد کرانا تھا۔ اس طرح اپنے اقتصادی امتیازات کے ساتھ بورژوؤں کے چیلنج کو

مذہبی عقائد اور رجحانات، تعین اقدار کی ترجیحات اور انسانی سماجی زندگی اور تہذیب کے بیشتر پہلوؤں پر اپنا کام کرنا پڑا۔ نو وارد سرمایہ دارانہ قوتوں کو اپنے سماجی تسلط کو قائم کرنے کے عمل میں یہ تمام امور کرنے کی ضرورت تھی۔

نشاۃ ثانیہ اور ریفارمیشن کی نظریاتی خدمات کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یوروپ کے تاریخی تسلسل میں اس کے بعد سماجی اور تصوراتی ماہیت قلب روشن خیالی (Enlightenment) کی صورت میں ہوئی۔ دانشورانہ تاریخ میں یہ ایک بڑا واقعہ تھا جو غیر منظم طور پر 1688ء میں انگلینڈ کے شاندار انقلاب کے بعد شروع ہوئی اور جس کا اختتام ایک صدی کے بعد فرانس کے انقلاب کی صورت میں ہوا۔ ڈزورٹ والیر (voltaire)، ردسو (Rousseau) ماتیس کیو (Montcsquieu)، ایڈم اسمتھ (Adam Smith)، گوئٹے (Goethe)، سلچر (Schiller) اور بہت سے اہم مفکرین روشن خیالی کے فلسفے کے متبعین میں تھے۔ انہوں نے اپنی بات اس مفروضے سے آگے بڑھائی کہ روشن انفرادی شعور سماجی برائیوں اور غلطیوں سے نجات دلانے میں سب سے اہم رول ادا کرتا ہے۔ ان کا مقصد خیر، آزادی، انصاف، اور سائنسی معلومات کو پھیلانا تھا۔ اپنے اختلافات کے باوجود اس کے عمومی نقاط انسانی وجود کے مادی زاویہ، علم اور سماجی اخلاقیات سے متعلق افادی خیالات کے ذریعے انسانی ترقی کے بارے میں انتہائی درجے کی رجائیت (relentlass optimism) کے طور پر بیان کیے جا سکتے ہیں۔

روشن خیالی کے فلسفہ کا سرمایہ دارانہ آداب و رسوم کے ساتھ ارتباط یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم سماجی زندگی سے متعلق ان کے بنیادی اصولوں اور تنظیم پر توجہ دیں۔ روشن خیال فکر کی اس طرح کچھ خصوصیات فرد کی خود اختیاریت، آزادی، انسانی مساوات، آفاقی قانون کے روابط کی حرمت، رواداری، اور نجی ملکیت رکھنے کا حق ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مذکورہ تمام عناصر بازار مبادلے (Market Exchange) کے نظام کے لیے لازمی ہیں۔ اس طرح روشن خیالی کے نظری سماجی اصول سرمایہ داری کے لیے ایک ہمہ جہتی جواز کے حامل ہیں۔

4.3 نظریہ کے معنی Meaning of Ideology

لفظ آئیڈیالوجی کا استعمال غالباً سب سے پہلے فرانس میں ہوا۔ عقلیت پسند فلسفیوں نے اس لفظ کا استعمال انسانی ذہن کے فلسفوں کے طور پر اس وقت رائج تصورات کے لیے کیا تھا۔ انگریزی محاورہ میں آئیڈیالوجی کا استعمال تصورات کی سائنس کے علم کے معنی میں کیا گیا۔ روشن خیالی کے فلسفوں کو فروغ دینے میں سائنٹفک معاشرتی تصورات کی تجرباتی اہمیت کا رول بہت اہم ہے۔ 1789ء کے فرانسیسی انقلاب میں روشن خیالی کے فلسفوں کا بڑا عمل دخل رہا۔ اس انقلاب کو عوامی اقتدار کے حصول کے لیے متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اسی دہائی کے اختتام پر نپولین بوناپورٹ لین۔ ا (نپولین۔ ا) نے حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اس نے مابعد الطبیعات کے تصور کو دھندلا کرنے اور خالص انسانی علم اور تاریخ کے اسباق کے ساتھ اپنے سماجی۔ سیاسی تصورات کو ہم آہنگ کرنے میں پوری طرح ناکامی کے لیے روشن خیال فلسفیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ نپولین کے حملے نے آئیڈیالوجی کو غیر حقیقی غیر عملی اور متعصب رجحانات کے معانی پہنا دیے۔

نپولین نے فلسفیوں پر الزام لگایا کہ وہ عام لوگوں کو اقتدار تک پہونچا کر انہیں گمراہ کر رہے ہیں کیونکہ عام لوگ اقتدار چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس نے روشن خیالی کے اصولوں کو ہی آئیڈیالوجی قرار دیا۔ عقلیت پسندی کا عنصر ہی آئیڈیالوجی کی خوبی ہوتا ہے۔ عقلیت پسندی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی چیز کو ترقی دینے کے لیے براہ راست عمل کیا جائے اور نہ یہ کہ چند عملی مشاہدات کی توضیح کے لیے مناسب نظریاتی اصول تلاش کیے جائیں، بلکہ عوامی اقتدار کے لیے نظریہ سازوں کی حمایت عوام اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں ان کے اپنے خیالات پر مبنی ہوں گے۔ نپولین کی تنقید کا مطلب یہ تھا کہ نظریہ ساز عوام کو ان کے مرتبے سے کہیں زیادہ اور ان کی صلاحیتوں سے کہیں کم تر باور کراتے ہیں۔ اس قسم کی عقلیت پسندی نے ان لوگوں کی ذہنی کارکردگی پر اثر انداز ہو کر نظریات کو فروغ دیا۔ جو اس میں دلچسپی رکھتے تھے ایک معنی میں نپولین کا خالص انسانی علم اور تاریخ کے اسباق پر زور خود ایک نظریاتی معنی رکھتا تھا جو روشن خیال مفکرین کے موقف کا مخالف تھا۔ یہ سیاسی اقتدار کی نوعیت کے بارے میں جمہوری اور غیر جمہوری طبقوں کے درمیان تصادم کا معاملہ تھا۔ نپولین خود اپنے ایک شخصی اتھارٹی کے دعوے کو عالمگیر معیار کے کسی تاریخی اصول کے تحت ثابت نہیں کر سکتا، وہ خالص عملیت پسندی (Pragmatism) کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ مخصوص حالات میں عملیت پسندی فوری مسئلے سے نجات کا ذریعہ ہو سکتی ہے مگر خود عملیت پسندی اپنے آپ کو

کافی حد تک اس دنیاوی نظریاتی مقولہ سے الگ نہیں رکھ سکتی کہ کامیابی سے زیادہ کچھ بھی کامیاب نہیں ہوتا ہے (Nothing Succed like Success) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہر آئیڈیالوجی پہلے سے موجود معاشرتی نظام، اس کی اقتصادیات، سیاسیات اور اس کی تہذیب کی موافقت یا مخالفت میں پروان چڑھتی ہے۔ ایسی صورت میں مختلف نظریات میں اس وقتی اور اخلاقی عقائد کی مختلف صورتیں، عمل ردعمل اور تبدیلی کے تاریخی عمل میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔

اب ہم دو مختلف معنی بیان کرتے ہیں جن میں نظریہ (Ideology) کی اصطلاح تاریخ اور معاشرہ کے بارے میں انسانی فکر کے ارتقاء کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے مراد کسی مخصوص معاشرہ سے متعلق تصورات ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات ہر طبقہ کے ساتھ الگ الگ ہو سکتے ہیں جو مخصوص طبقہ کے مفادات سے متاثر ہوں، اسی طرح یہ معاندانہ بھی ہو سکتے ہیں اور مصالحانہ بھی۔ اور اس طرح ایک نظریہ کے ساتھ بورژوا یا پرولتاری وغیرہ وغیرہ لیبل چسپاں ہو جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا نظریہ اس طبقہ کے مخصوص مفادات کو ثابت کرنے والے رجحان کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے جواز کا عام طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ان مخصوص مفادات کا فروغ پورے معاشرہ کے عام بہبود کے حق میں ہے۔

نظریے کی اصطلاح کا استعمال ہجویہ (Pejorative) انداز میں بھی ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے غلط مشاہدہ اور غلط استنباط سے پیدا ہونے والا مغالطہ۔ نپولین نے اس معنی میں عوامی اقتدار کے نظریات کی زبردست تنقید کی ہے۔ اس کی تنقید جو اسی تجربہ اور نظریے پر بنی علم کے درمیان فرق ظاہر کرتی ہے۔ اپنی ابتدائی تحریروں میں، مارکس اور اینگلس (Engels) نے ہیگل کی تصوریت کے مشتملات، اس کے طریقہ کار پر تنقید کرتے ہوئے آئیڈیالوجی کی اصطلاح کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان لوگوں نے لیوڈوگ فایرباخ (Ludwig Feuerbach) کی مادیت پسندی کی محدودیت کو اجاگر کرتے ہوئے بالکل یہی تنقیدی انداز اختیار کیا تھا ریاست (State 1813) اور حقوق (Right (1843-44) اور اقتصادی اور فلسفیانہ مسودات (Economic and Philosophical Manuscripts -1844) میں ہیگل کے فلسفوں کی تنقید کرتے ہوئے مارکس نے آئیڈیالوجی کا کوئی واضح ذکر نہیں کیا۔ اس نے سارا زور ہیگل (Hegel) کی تقلیب پر صرف کیا۔ مثال کے طور پر فکر کا وجود کے ساتھ اصل مطلب یہ ہے کہ وجود مسند الیہ (Subject) ہے اور فکر مسند (Predicate) ہے۔ ہیگل فکر کو مسند الیہ اور وجود کو مسند قرار دیتا ہے۔ ہیگل کی تقلیب کے نتیجہ میں بے شمار ابہامات اور غیر یقینی نتائج سامنے آئے۔ تقلیب کی چند مثالیں دیکھیں! ہیگل ایک آمرانہ خود مختار ریاست کو تقدیس عطا کرتا ہے جب کہ دوسری طرف تاریخ کے سلسلہ کو شعور کی آزادی کی طرف ارتقاء بھی قرار دیتا ہے مزید یہ کہ انسانوں کو پیدا کرنے والے خدا کے بارے میں ہیگل کے تصور میں بھی اسی قسم کی تقلیب موجود ہے۔ انتہا پسند ہیگل کے حامی لیوڈونگ فایرباخ (Ludeing Feuerbach) نے اپنی کتاب (The Essence of Chrirstianity(1814) میں یہ بحث کی ہے کہ خدا خود اپنی ہی شکل میں انسانوں کا پیدا کردہ ہے جو علم، اختیار اور لامحدود طاقت سے مزین محبت کے انسانی تصورات کا ہی حاصل ہے۔ اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ہی مارکس نے مذہب کی نوعیت کا تجزیہ کیا، اس کی جڑیں حقیقی دنیا کے تضادات اور تکالیف میں تلاش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مذہب ستم رسیدہ مخلوق کی آہ، ایک بے دل دنیا کا دل اور بے روح حالات کی روح ہے، یہ لوگوں کے لیے افیون ہے۔ (Critique of Hegel Philosophy of Right Introduction) اپنی کتاب (Economic and PhilosphicalManuscripts(1844) میں مارکس نے صرف فلسفہ کی دنیا کا جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ اس کی تنقید میں سرمایہ دارانہ معاشرہ میں موجود اقتصادی تعلقات کا بھی احاطہ ہے نجی سرمایہ دار املاک کی جاگیر میں معاشرے سے محنت کا انقطاع (Alienated Labour) اور اس کے مختلف تضادات کا مارکس نے پہلی بار تجزیہ کیا تھا۔ اس نے لالچ اور حسد کے اسباب کے تعلق سے بھی چند اہم نکات کی نشاندہی کی جو انسان کو بیگانگی (Alienation) کی غلامیت سے نجات دینے کی راہ میں بڑی رکاوٹ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ایک دوسری اہم کتاب مارکس اور اینگلس نے 1845-46 کے دوران ترتیب دی جو کہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکی۔ The German Idealogy نامی یہ کتاب پہلی بار 1932ء میں ماسکو میں منظر عام پر آئی (A Contribution to the Critique of political Economy) نامی کتاب کے اپنے پیش لفظ میں مارکس نے اس وقت تک غیر مطبوعہ جرمن آئیڈیالوجی کے مسودہ کا حوالہ ان الفاظ میں دیا تھا:

''ہم نے جرمن فلسفہ کے نظریاتی نقاط نظر کے ساتھ اپنے اختلافات کو حل کر لیا جو دراصل ہمارے پہلے کے فلسفیانہ شعور سے مصالحت تھی۔ یہ حل مابعد

ہیگل فلسفہ کی تنقید کی شکل میں سامنے آیا۔ مسودہ کی دو ضخیم جلدیں ویسٹ پھالیا (Westphalia) میں طباعت کے لیے اپنی جگہ پہونچ چکی تھیں جہاں خبر ملی کہ بدلے ہوئے حالات اس کی طباعت کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم نے اس مسودہ کو جان بوجھ کر چوہوں کے کترنے کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ ہم نے اپنا اصل مقصد ذاتی وضاحت حاصل کر لیا تھا۔''

مارکس اور اینجلس اپنے ابتدائی دور میں ہیگل کے کٹر حامی تھے۔ جس کی وضاحت متذکرہ بالا اس جملہ سے بھی ہوتی ہے کہ پہلے کے اپنے فلسفیانہ شعور سے مصالحت۔ ہیگل کے تصوریت (Idealism) کے نظریہ سے اس کی علیحدگی کو یقینی بناتے ہوئے جرمن آئیڈیالوجی میں پہلا مارکس کا بیان سامنے آیا کہ مختلف مراحل کے ذریعہ تاریخی ارتقاء کا انحصار پیداواری طاقتوں (Productive Forces) اور پیداواری تعلقات (Productive Relations) کے رابطہ پر ہوتا ہے، دراصل اس مشاہدہ نے تصورات سے عملی انسانی حیاتی سرگرمی کی طرف رخ منتقل کر دیا۔ مارکس نے فیرباخ (Feuerbach) پر اپنے آٹھویں مقالے میں یہ مشاہدہ پیش کیا ہے کہ تمام معاشرتی زندگی لازماً عملی ہوتی ہے وہ سارے اسرار جو سریت (mysticism) کے نظریہ پر زور دیتے ہیں انسانی عمل اور اس عمل کے ادراک میں ایک عقلی حل پا لیتے ہیں۔ وہ ایسی مادیت کی بھی تنقید کرتے تھے جو شے (Object) کو حیاتی انسانی سرگرمی اور نظریہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔

اس کتاب کے ٹائٹل میں نظریے کی اصطلاح نمایاں نظر آتی ہے۔ اس میں پیچیدہ تقلیب یہ ہے کہ شعور کو مادی حقیقت کے مقابلہ ترجیحی حیثیت دی گئی ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ نازک انسانی مسائل کی جڑیں اصل معاشرتی تضادات میں پیوستہ ہیں۔ ان مسائل کی اصل غلط طریقے سے متخرج تصورات میں تلاش کرنا بالکل گمراہ کن امر ہے۔ اس نکتہ کو ثابت کرنے کے لیے مارکس نے کتاب کے پیش لفظ میں ایک دلچسپ کہانی لکھی ہے۔

''بہت پہلے کی بات ہے کہ ایک ایماندار شخص کا خیال تھا کہ لوگ پانی میں اس لیے ڈوب جاتے ہیں کہ کشش زمین کا تصور ان کے ذہنوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اگر لوگ اس تصور کو اپنے ذہنوں سے نکال پھینکیں کہ یہ ضعف الاعتقادی اور مذہبی تصور ہے، تو لوگ پانی کی طرف سے کسی بھی قسم کے خطرے کا شکار نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی ساری زندگی کشش زمین کے فریب کے خلاف لڑتا رہا جس کے غلط نتائج ہی سامنے آئے اور سارے اعداد و شمار اس کے سامنے نئے اور متعدد ثبوت پیش کرتے رہے، وہ ایماندار شخص جرمنی میں نئے انقلابی فلسفیوں کی ایک مثال تھا''۔

مارکس کی بعد کی نظریاتی تحریروں میں ہمیں نظریے کی اصطلاح کا استعمال خال خال ہی نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اس عہد کی مشہور کتابیں ہیں: (Grundrisse-1857-58) (A contribution to the critique of political Economy)(1859) اور (Capital Vol, I,1867)۔ مزید یہ کہ اقتصادی فکر کے تاریخی ارتقاء کا تفصیل تجزیہ (Theories of Surplus value (1816-63) کی تین جلدوں میں شامل ہے، جس کی اپنی اہمیت ہے۔ یوروپ میں بالخصوص انگلینڈ اور فرانس میں سرمایہ داری کی ترقی کے مختلف مراحل کے حوالے سے اقتصادی فکر کی اضافیت (Relativity) کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مارکس نے اپنے معاصر یورپ میں وقوع پذیر بہت سارے واقعات پر اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف حکمت عملیوں پر اثر انداز ہونے والی غلطیوں اور فروگذاشتوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ (A Critique of the Gotha Programme(1873) اس تنقید میں ہمیں سرمایہ دارانہ نظام سے اشتراکیت کی طرف تاریخی سفر کی رفتار اور اشتراکیت کے ابتدائی اور ترقی یافتہ مراحل سے متعلق تقسیم کاری اور انتظامی دشواریوں کے بارے میں چند مارکسی تصورات کی جھلک مل جاتی ہے۔ ترقی یافتہ مرحلہ کمیونزم کی آمد کی خبر دیتا ہے، جس نے ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تصویر پیش کی جو ہر کسی کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت کا حامل ہوگا، اور اس طرح سارے لوگوں کے لیے مکمل اور موثر آزادی کو یقینی بنایا جائے گا۔ سرمایہ دار پرائیویٹ ملکیت جو کی ہمیشہ ہی اصل پونجی میں اضافہ کے ساتھ ہی پیداواری طاقتوں کی سائنٹفک ترقی اور محنت کش طبقہ کی بدولت زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے اصل پونجی کی بہت زیادہ خواہش کے رجحان کے درمیان روز بروز بڑھتے ہوئے تضادات پر مارکس نے اپنی توجہ مرکوز کی۔ سرمایہ داری کی توسیع کے عمل کی مخالفت سے یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ مزدور (Capital-Labour) پیداوار کا تعلق پیداواری طاقتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

مارکس نے سوشلسٹ انقلاب کی منطق اس طرح پیش کی ہے۔ اصل سرمایہ کی اجارہ داری پیداوار کے طریقوں کے لیے رکاوٹ بن گئی ہے، جس نے تیزی

سے ترقی کی ہے اور ابھی مزید ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ پیداوار کی آمدنی کو مرکز کے تحت لانے اور محنت کو اشتراکی بنانے کا عمل آخر کار ایک نتیجے پر منتج ہوتا ہے جو کہ اپنے سرمایہ دار خول سے متضاد ہے، یہ خول پھٹ کر بکھر چکا ہے۔ سرمایہ دار پرائیویٹ پراپرٹی کی ماتمی گھنٹیاں بجنے لگی ہیں، بے دخل کرنے والوں کو ہی بے دخل کر دیا گیا (Capital vol.I,ch.32)

ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ لفظ نظریے (Ideology) کا استعمال مارکس کے بعد کی تصنیفات میں خال خال ہی ہوا ہے۔ نظریے کے بالکل منفی معنی جیسے غلط شعور کے مترادف قرار دیا گیا جس کا استعمال اینجلس (Engles) کی بعض تحریروں میں ہوا ہے۔ چونکہ منفی استعمال میں نظریے کا مطلب ہوتا ہے کسی خیال کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا تاکہ حقیقت میں موجود تضادات پر پردہ ڈالا جاسکے۔ حالانکہ سرمایہ دارانہ نظام تضادات سے بھرا پڑا ہے اور استحصال زدہ طبقے کے لیے مختلف خطرات پیدا کرتا ہے۔ مارکس کے الفاظ میں، بورژواں نظریہ پورے نظام کو انسان کے پیدائشی حقوق کی جنت کے طور پر پیش کرتا ہے، جہاں صرف آزادی مساوات، جائداد اور بینتھم (Bentham) کی حکمرانی ہے اور اس طرح نظریہ اور غلط شعور کا مرادف گمراہ کن ہوسکتا ہے، اگر ان تضادات کی مناسب تفصیلات موجود نہ ہوں جن کو مخفی رکھنے کی کوشش کی جارہی ہو۔

مارکس نے اپنی کتاب (A Contribution to the Critique of Political Economy(1859) کے پیش لفظ میں یہ مشاہدہ بھی کیا ہے کہ پیداوار کی اقتصادی شرائط کی مادی تبدیلی کے درمیان ہمیشہ فرق کیا جانا چاہیے جس کا تعین نیچرل سائنس کی صداقت اور قانونی، سیاسی، مذہبی، جمالیاتی یا فلسفیانہ مختصراً نظریاتی شکلوں میں کیا جاسکتا ہے۔ جن سے انسان اس تصادم سے آگاہ ہوتا ہے اور ایک نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ اس قسم کی نظریاتی شکلیں نہ تو غلط شعور کو ظاہر کرتی ہیں اور نہ وہ محض اوہام ہوتی ہیں۔ مارکس ایک مکمل تہذیبی مجموعے اور اس کے ابعاد ثلاثہ کا خیال رکھتا ہے۔ لینن (Lenin) نے بھی نظریے کی اصطلاح کا استعمال بالکل اسی انداز میں کیا ہے وہ اکثر و بیشتر اس طبقہ کو بیان کرتا ہے جو تصورات کے نظام بوژواں آئیڈیالوجی اور پرولتاری آئیڈیالوجی سے وابستہ ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ایک معروف اطالوی مارکسٹ آنتونیو گرامشی (Antonio Gramsci) معاشرتی تسلط (Hegemany) کے نظریاتی سمتوں کی اہمیت کے بارے میں اپنے استدلال کو مارکس کی متذکرہ عبارت سے مضبوط کرتا ہے۔ کسی معاشرتی نظام میں نظریاتی رویوں کی اہمیت مارکس کے ''بنیاد'' اور ''اولیٰ ساخت'' کے تصور کے ساتھ جوڑی جاسکتی ہے جو اقتصادی عمل میں معاشرتی دائرہ کی تفہیم کے لیے اشارہ ہے جس کا اظہار مختلف شعبوں جیسے قانون، مذہب، فنون، فلسفہ، اور سیاست میں ہوتا ہے۔ مارکس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقتصادی بنیاد پر کل پیداواری رشتے معاشرے کا معاشی ڈھانچہ تشکیل کرتے ہیں۔ یہی اصل بنیادیں ہیں جن پر ایک قانونی اور سیاسی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اور معاشرتی شعور اور اس کے اظہار کی مختلف شکلیں جن کے مطابق ہوتی ہیں۔ بنیاد اور اولیٰ ساخت (Base and Super Structure) کا مخصوص استعارہ اقتصادی مسئلۂ جبر کو جنم دیتا ہے۔ تاہم مارکس علت و معلول کے کسی یک رخی علی رشتے پر زور نہیں دیتا جو کہ اقتصادی دائرہ سے اس کی تخلیقی تنوع کے پیدا کردہ نظریے تک پہنچے۔ یہاں مادی اور روحانی پیداوار کے درمیان باہمی اثر کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ تصورات کی اولیٰ ساخت کو ریاست اور مادی پیداوار کی شکلوں کے صرف انفعالی عکس کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ مارکس کچھ مثالیں پیش کرتا ہے کہ قانونی اور جمالیاتی پیداوار کو مادی پیداوار کے حصے میں نہیں لایا جاسکتا ہے، رومن پرائیویٹ قانون کے عناصر کو سرمایہ دار پیداوار کے مرحلے میں باقی نہیں رکھا جاسکتا ہے، یونان نے فنون اور ادب میں مادی پیداوار میں غیر ترقی یافتہ ریاست ہونے کے باوجود بلند مقام حاصل کیا۔

4.4 بعد کے کچھ مصنفین — Some Later Writers

آئیڈیالوجی کے معنی کو سمجھنے کے لیے ہم نے مارکسی فکر کے عناصر کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ تاریخ کی حرکیات معاشرتی پیداوار کے دائرہ میں اپنی قیادت برقرار رکھنے کے لیے برسرپیکار طبقوں کی اضافی صلاحیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ مارکس کے حوالے سے ہم نے بیان کیا ہے کہ نمو پانے والی پیداواری طاقتوں اور موجودہ پیداواری رشتوں کے درمیان تصادم ایک انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جس سے ایک نئی طبقاتی قیادت کے تحت ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا۔ تاریخی تبدیلی کے نظریے کے شواہد کے طور پر مارکس نے جو ثبوت فراہم کیے وہ سرمایہ دارانہ تبدیلی تک ہی محدود ہیں۔

تاریخ کا اگلا مرحلہ سوشلزم کی آمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف پرولتاریوں کے برپا کیے گیے عالمی انقلاب کے ذریعہ ظاہر ہوا

REFERENCE ONLY

، چونکہ پرولتاری غیر طبقاتی معاشرہ کی طرف مرحلہ وار بڑھ رہے تھے اس لیے کسی غالب بر سر اقتدار طبقہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے مکر وفریب اور نظریاتی دفاع کی مزید ضرورت نہیں تھی۔ مارکسیوں کی جانب سے عام جواب یہی دیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ محنت کش طبقہ اور اس کے مفادات کا ہی حامی ہے اس لیے اس میں مارکس نظریہ کے عناصر ہیں۔ ایک بار پھر معاشرتی انسان کے شعور کے تعین کے بارے میں بیان کردہ یہ نقطہ اس بیان کے مفہوم کے ساتھ کسی قسم کے تعلق کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ درجۂ حرارت میں گراوٹ کی وجہ سے پانی برف بن جاتا ہے۔ یہ خود مارکس کا بیان ہے کہ حالانکہ پیداوار کی اقتصادی شرائط کا پتہ نیچرل سائنس کی صداقت کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے لیکن نظریاتی رویے بھی معاشرتی شعور کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے مناسب ہیں جو مختلف سطحوں پر اس کے اردگرد کی حقیقت کو انگیز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جرمن ماہر عمرانیات کارل مین ہیم (Karl Minnheim (1893-1947) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نظریات ذہنی افسانے ہیں جن کو کسی مخصوص معاشرہ کی اصل نوعیت کو مخفی رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مثالی معاشرہ (Utopia) خوش فہمی پر مبنی خواب ہے جو عطائی مفادات کی مخالفت پر ابھارتا ہے، اس طرح مین ہیم نے موجودہ حامی اور مخالف نظریات کے درمیان بڑا اہم فرق کیا ہے۔ طبقاتی شعور مارکس کے معاشرتی تبدیلی کے نظریہ کا نہایت ہی اہم عنصر ہے۔ جارج لوکاچ (George Luckacs (1885-1871) ایک اہم مارکسی مفکر اور رکن نے فلسفہ، سماجیات اور سیاسیات کی جمالیاتی اور لٹریری تنقید سے پیدا شدہ موضوعات پر بڑی قیمتی تحریریں پیش کی ہیں، ان کی کتاب، (1923) (History and Class Consesciousness) ان دنوں کمیونسٹ اداروں کے درمیان بڑی متنازع فیہ ثابت ہوئی تھی تاہم اس نے بہت سے ممالک میں متشدد غیر تقلید پسند دانشوروں کے ایک بڑے طبقہ کو بہت متاثر کیا۔ لوکاچ (Lulacs) نے طبقاتی شعور کا جو تجزیہ کیا تھا وہ اقتصادیت پسندی (Economism) اور سائنسیت (Scientism) کی تنقید کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس نے اس پر زور دیا ہے کہ پرولتاری انقلاب بالکل سرمایہ دارانہ نظام کے اقتصادی تضادات سے ظہور پذیر نہیں ہوگا نہ ہی تاریخی تبدیلی کی وجہ سے بلکہ مزدوروں کے بیدار شعور کی وجہ سے ہوگا۔ مزدوروں کی کونسل کے انقلابی کردار پر بات کرتے ہوئے لوکاچ نے باشعور معاشرتی ایجنسی کے ذریعہ خود مختار حکومت کے پرولتاری عمل کی ضرورت پر زور دیا۔

لوئیس التھوسیر (Louis Althusser (1918-1990) کی مارکسیت کی تشریح جو کہ ان کی کتابوں میں دستیاب ہے، اس نے پختہ کار مارکس کے سیاسی، اقتصادی، نظریاتی، نظام کے متعلق اور نظریاتی ڈھانچوں اور عمل کے باہمی اشتراک پر مارکس کی بنیادوں پر توجہ صرف کی ہے، جو کہ مجموعی طور پر معاشرتی طاقتیں اور ان کے عمل کا تعین کرسکتی ہیں۔ التھوسیر نے نظریے کو (بشمول اقتصادی اور سیاسی) قائم شدہ معاشرتی تشکیل (Structured Social Fromations) کی حیثیت سے تاریخ کی اہم مثالوں میں شامل کیا ہے۔ اس صورت میں نظریے میں ایک معاشرہ میں سکونت پذیر لوگوں کے تعلقات کے معنی بھی شامل ہوجاتے ہیں۔

انٹونیو گرامسکی (AntonioGramsci(1897-1937) کا یہ تصور کہ تسلطی طاقت (Higemonic Power) ہمیشہ ہی ظلم واستبداد پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ زیر تسلط رہنے والے لوگوں کی جانب سے حاصل شدہ منظوری کے ٹوکن سے بھی وہ چلتی ہے۔ جس سے نظریے کو کچھ نئے معنی حاصل ہوئے۔ گرامسکی نے تاریخی طور پر نامیاتی نظریے اور خالص من مانے نظریے کے درمیان فرق کیا ہے۔ کس حد تک نظریے تاریخی طور پر ضروری ہیں۔ وہ انسانی گروہوں کو منظم کرتے ہیں اور ایسا خطۂ زمین پیدا کرتے ہیں جس پر لوگ چلتے پھرتے ہیں اور اپنے موقف اور اپنی جدوجہد کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ نامیاتی نظریے نفسیاتی جواز رکھتے ہیں، تاریخ کے عمل میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ نظریے اکثر وبیشتر سماجی سیاسی نظریات (Theories) اور ان کے منصوبوں سے پوری بیسویں صدی میں الگ نہیں رہے۔ ایک ایسے انسانی معاشرہ کو سمجھنا بالکل ناممکن ہے جس کی حمایت میں نظریہ نہ ہو۔ یہی حال اس معاشرہ کا بھی ہے جو اپنے مقاصد اور اپنی حصولیابیوں کے بارے میں تنقیدی سوالات سے بالکل آزاد ہو۔ اور اسی لیے تاریخ نظریہ کے جنم اور اس کی ناکامی پر نظر جمائے رہتی ہے۔

4.5 خلاصہ — Summary

نظریے کی اصطلاح کا استعمال اکثر دو مختلف طریقوں سے ہوا ہے ایک معنی میں یہ تصورات، نقاط نظر اور عقائد پر مشتمل ہوتا ہے جو کسی انفرادی یا معاشرتی

نظام سے متعلق ہوتا ہے۔اس کا استعمال موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے کے لیے ہوسکتا ہے لیکن اس کو نظام کی مخالفت کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔نظریے بہت سے ہوسکتے ہیں۔کبھی کسی مخصوص معاشرتی نظام کے سلسلے میں وہ بالکل ایک دوسرے سے مخالف ہوتے ہیں۔نظریے طبقات کے مطابق الگ الگ ہوسکتے ہیں۔مختلف معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام تاریخ میں اپنے معاصر غالب نظریوں کی وجہ سے ہی محفوظ رہ گئے۔

ایک دوسرے معنی میں نظریے کو غلط شعور کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جو کہ حقیقت اور دنیا کے سائنٹفک علم کا مخالف ہے، اس معنی میں اس کا استعمال لوگوں کو گمراہ کرنے اور موجودہ صورت حال کی حمایت پر اکسانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

Exercises 4.6 مشقیں

(1) نظریے کی اصطلاح سے آپ کیا سمجھتے ہیں اس کے مختلف استعمال پر بحث کیجیے۔

(2) تاریخ کی رفتار کو متاثر کرنے میں آئیڈیالوجی نے کیا کردار ادا کیا؟

Suggested Readings 4.7 کتب برائے مطالعہ

Tom Bottomore et al (ed.), *A Dictionary of Marxist Thought* (entry on "Ideology by Jorge Larrain)

David L.Sills(ed)., *International Encyclopedia of the Social Sciences vol.* 7 &8,"Ideology by Edward Shils and "Ideology and the Social System" by Harry M. Johnson.

John Plamentaz, Ideology.

T.Z.Lavine, *From Socrates to Sartre the Philosophic Quest,* Parts 4 & 5. Robin Blackburn (ed.) *Ideology in Social Sciences.*

Karl Lowith, *Meaning in History.*

Istvan Meszaros (ed.), *Aspects of History and Class Consciousness.*

R.G. Collingwood, *The Idea of History.*

Karl Mannheim, *Ideology and Utopia.*

E.P. Thompson, *The Poverty of Theory & other Essays* (he last essay bearing the title of the book).

Martin Selinger, *The Marxist Conception of Ideology.*

Sholmo Avineri, *The Social and Political Thought of Karl Marx.*

REFERENCE ONLY

بلاک 2 ماقبل جدید روایات

PRE-MODERN TRADITIONS - 1

What is historiography? تاریخ نویسی کیا ہے؟

ہماری نظر میں تاریخ وہ ہے جو ہو چکا ہے اور تاریخ نویسی اسے کہتے ہیں کہ ماضی میں جو کچھ تاریخ یا تو لوگوں نے زبانی یاد کر کے یا اسے تحریری شکل میں کیسے مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح تاریخ نویسی تاریخ لکھنے کی تاریخ ہے۔

اگر ہم ذرا سا غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ تاریخ کا علم ضرور ہوتا ہے کیونکہ ماضی میں جو کچھ اس کے ساتھ یا اس سے متعلق دوسرے حضرات کے ساتھ ہوا، وہ اس سب سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ یادداشت اس فرد سے مخصوص واقعات یا اپنے متعلق افراد کے ساتھ جو کچھ اس نے ہوتے دیکھا ہے، تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس محدود معلومات سے باہر نکل کر ذرا بڑے پیمانے پر کسی سماج یا گروہ کا مطالعہ کریں کہ ماضی میں ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے تھے تو اسی کو تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کہا جاتا ہے۔

Beginnings of Historiography تاریخ نویسی کا ابتدائی دور

نہ صرف تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں بلکہ آج بھی تاریخ کا ایک بڑا حصہ زبانی شکل میں موجود ہے، جو لکھا نہیں گیا ہے بلکہ گیت یا نغموں کی شکل میں لوگوں کے حافظے میں موجود ہے۔ ہندوستان میں بھانڈ اور قصہ گو وغیرہ ہوا کرتے تھے جو لوگوں کو ماضی کے مشہور قصے سناتے تھے۔ اس کو بھی ایک طرح کی تاریخ ہی مانا جائے گا۔ جب تاریخ کچھ معاشروں میں تحریری شکل میں سامنے آئی جس کے نتیجے میں یہ ایک مستقل دستاویز بن گئی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ یہ ایک وقت میں کئی لوگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اس طرح بنی نوع انسان کی تہذیبی تاریخ میں تاریخ نویسی کی ایک نئی صورت سامنے آئی۔

ہم اس یونٹ میں (بلاک 2) تاریخ نویسی کا جائزہ تین قدیم تہذیبوں ہندوستانی، چینی اور یونانی - رومی روایات کی روشنی میں لیں گے۔ جیسا کہ ان یونٹوں کے مصنّفین نے بیان کیا ہے کہ تاریخ نویسی کا ارتقاء درجہ بہ درجہ مختلف ادوار اور مختلف تہذیبوں میں ہوا ہے اور اس پر نکھار آتا گیا لیکن یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ کچھ گروہ یا معاشرے اس سے بالکل بے بہرا تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تاریخ کے مختلف رجحانات، مختلف تہذیبوں میں سامنے آئے۔ بھلے ہی آج یہ رجحانات اس سے میل نہیں کھاتے ہوں جسے جدید دور میں ہم تاریخ کہتے ہیں۔

Historical Method تاریخی طریقۂ کار

تاریخ نویسی کا مقصد عام طور سے رسم رواج، مشاہدے (Observation)، سماعی باتوں (Hearsay) کی بنیاد پر کچھ طریقۂ کار اور معلومات فراہم کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ داں جنھیں تاریخ نویسی کا پیش رو کہا جاتا ہے، نے حقائق کو کچھ اصولوں اور تقابلی طریقۂ کار کی بنیاد پر مختلف مستند شواہد اور دوسرے موجودہ ذرائع کی مدد سے درست کیا۔ ان حضرات میں قابل تعریف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے نتائج کو ذاتیات سے دور رکھا، چاہے وہ ان کی برادری سے متعلق ہوں یا ملک سے، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

مختصراً یہ کہ آج مستند حوالوں کی تلاش، ان کی جانچ پرکھ اور ذاتی تعصب سے نجات حاصل کرنا مؤرخین کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU Hyderabad-34. * IMC LIBRARY

یونٹ-5 یونانی-رومی روایات — Greco-Roman Traditions

ساخت — Structure

5.1	تعارف	Introduction
5.2	تاریخ نویسی کے سیاق	The context of History-writing
5.3	تاریخ نویسی کے مقاصد	The Objectives of History-writing
5.4	ماخذ کی شناخت اور معلومات کا حصول	Defining and Drawing on sources
5.5	طرز ادا	Style
5.6	تاریخی واقعات اور عمل کی تفہیم	Understanding Historical Events and Processs
5.7	تلخیص	Summary
5.8	مشقیں	Exercises
5.9	کتب برائے مطالعہ	Suggested Readings

5.1 تعارف — Introduction

آپ میں سے بیشتر لوگ اس بات سے باخبر ہوں گے کہ ''ہسٹری'' لفظ یونانی زبان کے لفظ ''اسٹوریا'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں دریافت، جانچ پڑتال- ہیروڈوٹس (Herodotus) جسے تاریخ کا باوا آدم کہا جاتا ہے، وہ پہلا مصنف ہے جس نے اس لفظ کو استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہیروڈوٹس اور اس کے متبعین (Successors) کے کاموں کو ایک کسوٹی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے کچھ کاموں کو جانیں اور سمجھیں۔ اس یونٹ میں آپ یونان اور روم کے چند تاریخ دانوں اور ان کی کچھ تحریروں (Works) کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

5.2 تاریخ نویسی کے سیاق — The Context of History writing

ہم نے مطالعے کے لیے زمانۂ قدیم یعنی 5 ویں صدی ق م کے ایسے چار تاریخ دانوں کو منتخب کیا ہے جو یونانی زبان میں لکھتے تھے (5 ویں صدی یعنی BCE بمعنی قبل عہد عامہ جسے BC بھی کہتے ہیں اور CE بمعنی عہد عامہ Common Era جسے AD کے نام سے بھی جانا جاتا ہے)۔ ان میں ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائڈس (Herodotus & Thucydides) اور لیوی (Livy) اور ٹیسی ٹس (Tacitus) رومن حکومت میں آگسٹن عہد (Augustan Era) میں (یعنی پہلی صدی BCE) لاطینی زبان میں لکھنے والے تھے۔ 5 ویں صدی ق م یونانی تاریخ میں عمومی طور پر اور اتھینز کی تاریخ میں خصوصاً کلاسیکی دور مانا جاتا ہے۔ جبکہ آگسٹن عہد کو رومن حکومت کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔

ان تاریخ دانوں کی تحریروں کو ان کے دور کے سیاسی اور تہذیبی حالات کے سیاق میں رکھا جاسکتا ہے لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا بہتر ہوگا کہ ان تاریخی سیاقوں اور تاریخی تلاش کے بیچ کوئی سہل باہمی رشتہ نہیں ہے۔ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت کی تاریخ نویسی کا مقصد عصری سیاسی نشیب وفراز کو صحیح ثابت کرنا یا ان کا جواز فراہم کرنا تھا۔ حالانکہ یہ گمان پوری طرح غلط نہیں ہے پھر بھی ٹیسی ٹس اور لیوی اپنے ہم عصروں کے بڑے ناقد تھے۔ ان کی تحریریں صرف توصیفی نہیں ہیں بلکہ ان میں زمانۂ حال کے بارے میں تشویش بھی ہے۔

ہیروڈوٹس کا زمانہ 425-484ق م کے درمیان کا ہے۔ ہیروڈوٹس کی پیدائش یونانی کالونی ایشیا مائنز کے علاقے میں ہوئی لیکن اس نے مغربی ایشیا میں فلسطین، بیبی لان، شمالی افریقہ، خاص طور پر مصر میں میڈیٹرین (Mediterranian) سمندر کے راستے سفر کیا اور یونان کے تمام علاقوں کا دورہ کیا۔ اس کی تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اس پر ایتھینز کا کافی اثر تھا اسی لیے اس میں یونان اور ایران کی جنگ کا ذکر ہے اور ایران پر فتح کو تاریخی قرار دیتے ہوئے اس کو جہالت پر تہذیب کی فتح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تھیوسی ڈائڈس کا زمانہ (460-400 ق م ہے۔ ایتھینز کے ساتھ اس کا تعلق اور زیادہ قریبی ہے۔ وہ ایتھینز کا تھا اور پیلوپونیشن (Peloponnesian) جنگ کے دوران جنرل تھا۔ حالانکہ جنرل کی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ یہ جنگ ایتھینز اور اسپارٹا (Sparta) کے بیچ رسہ کشی تھی جو لگ بھگ 30 سال تک چلی۔ جس میں یونان کی تمام ریاستیں ایک دوسرے کی حمایت میں آپس میں برسر پیکار ہوئیں۔ جنگ میں ناکامی کے سبب تھیوسی ڈائڈس کو ملک سے نکال دیا گیا اور کافی عرصہ اسے ایتھینز مخالف ریاستوں میں گزارنا پڑا۔ اس کی تمام تحریروں میں اس کے تجربے کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائڈس عام طور پر یونان اور خاص طور پر ایتھینز کے کلاسیکی دور کی پیداوار ہیں۔ یہ دور فلسفیوں کے دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں سقراط جیسے فلسفی اور ایس کیلس، سوفوکلیس اور یوری پائڈس جیسے ڈرامہ نگار تھے۔ ان تاریخ دانوں کی تحریروں میں براہِ راست طور پر اس تہذیبی تمول کی تفصیل نہیں ملتی بلکہ ضمنی طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے بجائے خاص طور پر تھیوسی ڈائڈس کی تحریریں جنگی تفصیل سے لبریز ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس طرح کی تمام تاریخوں میں اگر تاریخی تفصیلات خاطر خواہ ہیں تو یہ تحریریں ایک انتہائی محدود دائرے کی بھی حامل ہیں۔ آج کا قاری بے شک یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کو بڑے پیمانے پر وسیع مدددوں کے لیے استعمال کیا ہوتا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ لیوی اور ٹیسی ٹس سلطنت کے سیاق میں کافی قریب تھے۔ روم ایک بالکل منفرد نوعیت کا ادارہ تھا۔ روم کی حدود میں تین براعظم یوروپ ایشیا اور افریقہ شامل تھے۔ روم کا یہ دور لگ بھگ 5 صدیوں تک رہا۔ یہ سلطنت اپنے مخصوص حکمراں طبقے کے لیے بھی مشہور تھی، جس کی رکنیت کے حصول میں کافی لچک تھی۔

لیوی 64-17 ق م) جو تاریخ روم کی مشہور ہستی آگسٹس کا ہم عصر تھا۔ مگر نہ تو وہ حکمراں طبقہ کا حصہ تھا اور نہ ہی اس کا سیاست سے کوئی تعلق تھا۔ پھر بھی یہ شاید اتفاق نہیں تھا کہ اس نے روم کی تاریخ پر 142 کتب کا ذخیرہ چھوڑا، بدقسمتی سے جس میں سے اب صرف چند کتب ہی محفوظ ہیں اور وہ بھی تلخیص کی شکل میں جو بعد کے مصنفین نے ترتیب دیں ہیں۔ اس کی سو سے زیادہ کتب تو ضائع ہوگئیں۔ یہ تاریخ روم کے قدیم تہذیبی دور سے لے کر 9 ویں صدی ق م تک کے تفصیلی حالات کا احاطہ کرتی ہیں۔

ٹیسی ٹس (55-119ء) جو شہنشاہیت کے نظام سے کافی حد تک وابستہ تھا۔ ٹیسی ٹس ایک اچھا مقرر بھی تھا۔ اس کے انلس (Annals) میں روم کی سلطنت کی 50 سالوں کی (40 سے 65ء تک) تفصیل ہے۔ اس کی تحریروں میں آگسٹس کے دورِ حکومت کے اختتام سے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے اور فوج، نظام حکومت، جانشینی اور سیاسی معاملات میں فوجی دخل اندازی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کی تحریروں کی خوبی یہ ہے کہ حکومت کا حصہ ہونے کے باوجود اس نے جگہ جگہ حکومت کی سیاسی پالیسیوں کی تنقید کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ روم کے اشرافیہ طبقے میں کسی بھی طرح کی مماثلت نہ تھی۔ اس تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام ابتدائی تاریخ دانوں کی تحریروں میں ان کے سروکاران کے دور کے ماحول کے زائدہ تھے مگر مصنف اور سیاق کے درمیان کسی بھی قسم کا رشتہ سادہ یا یک خطی نہیں تھا۔

5.3 تاریخ نویسی کے مقاصد The Objectives of History Writing

یہ واضح ہے کہ تاریخ نویسی تفکر بالضمیر اور واضح متعینہ مقاصد پر مبنی تھی۔ جس میں وہ تمام یادداشتیں شامل تھیں جنھیں مقدم اور مکمل شواہد کی بنا پر صحیح مانا جاتا تھا اور اہم واقعات کی تفصیل بھی۔ کافی حد تک جنگی حالات کی تفصیل تاریخی بیانیوں میں چھائی ہوئی ہے۔ پھر بھی ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر دوسرے مقاصد بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہیروڈوٹس کے متعلق تو یہ بات ثابت ہے کہ اس نے بیشتر واقعات ایسے شامل کیے ہیں جو سننے میں نہ صرف اچھے لگیں بلکہ سامعین کو متوجہ بھی کریں۔ ... کی انسانی نشوونما سے متعلق تفاصیل زیادہ تر تخیئل پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد کے تاریخ نویسوں نے ذرا احتیاط سے کام لیا اور لاطینی تاریخ نویسوں نے سنجیدہ ضمیر کی آواز

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU IMC LIBRARY * Hyderabad-32

پر کان دیے۔ یہ پورے آگسٹس دور کا حال تھا کہ جہاں حکمراں دوسری تمام چیزوں کے علاوہ قدیم روایات کی باز آفرینی کو بھی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ زیادہ تر تاریخ نویسوں نے اپنے مقاصد پہلے ہی واضح کر دیے ہیں جیسے ہیروڈوٹس اپنے کام کی ابتدا میں ہی کہتا ہے:

''یہ کارنامے ہیروڈوٹس کی ایوین تحقیقات ہیں جس کا ان کو چھپوانے کا مقصد انسانی کارکردگیوں کو محفوظ کرنا ہے اور جو یونانیوں اور باربر کے عظیم اور بہترین کارناموں کی عظمت کو بچاسکیں، اور یہ بیان کرسکیں کہ ان کے جھگڑوں کی وجوہات کیا تھیں''۔ انھیں مقاصد کی تفصیل اس کی کتاب (IX کے 71ویں حصے) کے آخر میں موجود ہے۔ خاص طور سے یونانیوں کی فتح کی تفصیلات لکھتے ہوئے، ان کی جیت کے جشن کو بیان کرتے ہوئے اس نے ایران اور اسپارٹا کے جواں مردوں کی بہادری کو بھی تسلیم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو بات خاص طور پر قلم بند کرنے کے قابل تھی وہ عظیم جنگ اور اس کے نتائج ہی تھے۔ تھیوسی ڈائڈس نے بھی اس تناظر میں میں ان کی تفصیل لکھی ہے۔ جو مندرجہ ذیل طریقے سے شروع ہوتی ہے:

''تھیوسی ڈائڈس ایک ایتھینز کا باشندہ ہے اس نے پیلوپونیشن اور ایتھینز کی جنگ کی تاریخ لکھی ہے جو اس لمحے سے شروع ہوتی ہے جب جنگ شروع ہوئی اور اس یقین کے ساتھ کہ شاید یہ بہت مفید جنگ ہوگی اور ماقبل کی جنگوں کے مقابلے کہیں زیادہ اہم ہوگی''۔

اسی طرح کے جنگی حالات اور واقعات کی تفصیل لیوی اور ٹیسی ٹس کی تحریروں کی خصوصیت ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ عجب نہیں ہے کیوں کہ روم کی حکومت کی توسیع (Expansion) یقیناً جنگ پر ہی مبنی تھی۔ جن پر بہت سے رزمیے لکھے گئے لیکن ان حالات کے مدنظر اخلاقیات سے کام لینا واقعی تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ ہم آگسٹس دور کو روم کی حکومت کا سنہرا دور تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے تاریخ نویسوں کے یہاں بے چینی اور مایوسی حکومت کے زوال کے امکان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لیوی کے پیش لفظ سے یہ بات کچھ اور صاف ہوجاتی ہے:

''میں قارئین کی توجہ زندگی کے ان حالات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جن سے ہمارے بزرگوں کی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔ وہ کون تھے۔ سیاست اور جنگ میں ان کے ذرائع کیا تھے؟ جن کے سبب پہلے انھوں نے روم میں حکومت قائم کی اور بعد میں اس کی سرحدوں کی توسیع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی توجہ اخلاقی زوال کی طرف دلاؤں گا کہ پرانی تعلیم کے خاتمے سے پرانی اخلاقی اقدار تباہ ہوگئیں اور دھیرے دھیرے پورا ڈھانچہ زمین دوز ہوگیا۔ وہ جدید عہد کے سیاہ نور کو بھی دیکھیں گے کہ نہ تو ہم اپنے گناہوں کو سمجھ پا رہے ہیں اور نہ ہی ان کا مداوا تلاش کر پا رہے ہیں''۔

ٹیسی ٹس کی تحریروں میں بھی جنگوں کی تفصیل کچھ مختلف انداز میں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنگجوؤں کو ہیرو بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا انداز عصری حالات کی تنقید پیش کرنا تھا:

''میرا مقصد ہر واقعے کو بیان کرنا نہیں بلکہ ان واقعات پر توجہ دینا ہے جو کامیابی کے لیے لاجواب اور برائی کے لیے بدنامی کا سبب ہیں۔ میرے خیال میں ہر ضروری بات کو مدنظر رکھتے ہوئے آنے والی نسل کو ہر ممکن خطرات اور برائیوں سے باخبر کرانا تاریخ کا بنیادی فریضہ ہے''۔

لیوی اس بات کا خدشہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جو کچھ بیان کر رہا ہے ہوسکتا ہے وہ بے معنی ہوجائے:

''میں نے جو کچھ بھی کہا ہے یا مزید کہوں گا، ہوسکتا ہے اس کا زیادہ تر حصہ غیر ضروری یا معمولی نوعیت کا ہو لیکن اس بیان کا ان لوگوں کی تحریروں سے تقابل نہ کریں جنھوں نے قدیم روم کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ عمل بے کار اور بے سود ہے۔ انھوں نے جنگوں کے بارے میں لکھا ہے، شہروں کی تفصیل بیان کی ہے، بادشاہوں کی شکست اور ان کی اسیری کے حالات بیان کیے ہیں، جب بھی اندرونی حالات پر غور کیا تو انھوں نے عوام کی بدحالی، امرا کی تباہی، کھیتی باڑی اور عوام اور تاناشاہ حکمرانوں کے پیچ کشمکش کو موضوع بنایا۔ میری کوشش محدود اور بے مایہ ہے: امن پوری طرح ختم ہو چکا ہے یا تھوڑی بہت بدامنی ہے۔ دارالحکومت میں مایوسی چھائی ہوئی ہے، حکمراں سلطنت کی توسیع سے بے فکر ہیں۔ یہی مرے موضوعات ہیں۔ لیکن پھر بھی معمولی واقعات کا مطالعہ بے کار نہیں جائے گا کیونکہ بڑی بڑی تبدیلیاں انھیں معمولی تبدیلیوں اور حالات پر منحصر ہوتی ہیں یا ان کا نتیجہ ہوتی ہیں''۔

ٹیسی ٹس اور لیوی دونوں اپنی تحریروں کو سبق آموز ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیوی کا استدلال تھا کہ:

''جو چیز تاریخ کو مفید اور نفع بخش بناتی ہے وہ اس میں بے شمار انسانی تجربات کی موجودگی ہے جو ہم سب کے لیے مثال اور ریکارڈ کا کام کرتی ہے بلکہ ہم ان تجربات و واقعات کی بنا پر ملک کے لیے مثالیں تلاش کرسکتے ہیں اور آنے والے خطرات سے باخبر ہوسکتے ہیں''۔

ٹیسی ٹس مایوسانہ انداز میں لکھتا ہے:

''ایک انقلاب کے بعداب روم اُجاڑ بیابان (despot) کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا، صرف ایک شتر بے مہار ریاست کے سوا۔ اب اس عہد کو احتیاط کے ساتھ بیان کرنا اچھا ہوگا کیونکہ اب کچھ ہی لوگ ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ برائی اور اچھائی کو الگ کر سکیں جبکہ زیادہ تر لوگ دوسروں کی تقدیر سے سبق لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ رکارڈ یا مثال سبق آموز اور مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس سے حظ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ممالک کی تفصیل، جنگوں کے قصے، سپہ سالاروں کی شہادت کا بیان یہ سب قارئین کے ذہن کو باندھ دیتے ہیں اور اس کی یادوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔ مجھے قانونی فیصلے، پر اعتماد دوستی، معصوم لوگوں کی بربادی، اور وہ وجوہات بیان کرنا ہیں جن سے وہی نتائج نکلتے ہیں۔ میں ہر جگہ اپنے نفس مضمون کی نیرس یکسانیت سے جو جھتا ہوں۔''

زمانہ حال کے نیرس بوجھ نے ایسے تاریخ نویسوں کو خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں قدم رکھنے سے روک لیا۔ اس لحاظ سے ہیروڈوٹس کی تحریروں میں بڑا فرق ہے جو ان سب واقعات کی تفصیل اور بیان کو خوشگوار محسوس کرتا تھا جو اسے غیر معمولی لگتے تھے۔ اور انھیں بیان کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیتا تھا۔ باوجود اس کے اسے معلوم تھا کہ اس سے اس کے استناد کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ اس نے ہندوستان کا کبھی دورا نہیں کیا لیکن پھر بھی تخیل کی بنیاد پر اس نے یہاں کی سونا کھودنے والی چینٹیوں کا ذکر کیا ہے۔

ٹیسی ٹس جیسے مصنف جب لاجواب یا مثالی (fabulous) چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اس کی مثال فونکس (Phoenix) کے تذکرہ سے صاف ظاہر ہے:

''اس پرندے کا نام فونکس ہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد مصر میں جلوہ افروز ہوا اور مصر و یونان کے دانش مند طبقے کے لیے صحت مند بحث کے موضوعات کے لیے خاطر خواہ معلومات فراہم کی۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کے سامنے کچھ ایسی باتیں رکھوں جس پر وہ سب متفق تھے۔ بھلے ہی ان میں سوالات کی گنجائش ہو مگر اتنی بے تکی بھی نہیں کہ ان پر غور نہ کیا جائے۔ یہ پرندہ کتنے سال زندہ رہا اس کو لے کر بہت سی باتیں ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پانچ سو سال، کچھ کہتے ہیں کہ ہر بار چودہ سو اکسٹھ سال کے بعد نظر آتا ہے... لیکن یہ باتیں یقیناً ایک اندازے کے علاوہ کچھ نہیں۔''

5.4 ماخذ کی شناخت اور معلومات کا حصول — Defining and Drawing on Sources

ثبوتوں اور ماخذ کا سوال مختلف تحریروں میں کبھی مختصر طور پر ماحصل کی شکل میں اور کبھی تفصیلی انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جس پر ہم غور کر رہے ہیں۔ آنکھوں دیکھی باتوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی ہے جبکہ دوسرے معلوماتی ذرائع کو بھی کام میں لایا گیا ہے جیسے تہذیبی دستاویز، مذہبی ادارے، تاریخی تفصیلات (Chronicles)، انٹرویوز وغیرہ۔ بیانات میں فرق یا تضاد کو بھی مدنظر رکھا گیا اور ان کو سلجھانے کی کے لیے مختلف تدابیر سے کام لیا گیا۔ جیسے ہیروڈوٹس ایران کے حکمراں سائرس کے تاریخی بیان میں کہتا ہے:

''یہاں میں ایران کے ان لائق اعتماد لوگوں پر یقین کروں گا جن کا مقصد سائرس کی کامیابیوں کو بے وجہ طول دینا نہیں بلکہ حقیقت کی عکاسی کرنا ہے۔ میری نظر میں وہ تینوں انداز بھی ہیں جن میں سائرس کی کہانی بیان کی گئی ہے مگر میرا بیان ان سب سے جدا ہے۔ (کتاب I، حصہ 95)

قدیم آثار اور روایات جو مقابر سے وابستہ ہیں، ذرائع کے نقطۂ نظر سے کافی اہم ہیں اور اسی لیے انھیں بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح کی ایک مثال ڈیلفی کا مٹھ (Shrine) ہے جس کے اقوال ہاتف سے اہم موقعوں پر جیسے جنگ پر جانے وغیرہ سے پہلے بادشاہ اور سلطنت ہمیشہ رجوع کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس نے ان اقوال ہاتف میں سے کچھ پیشین گوئیوں کو بیان کیا ہے جن کا اظہار اکثر شعوری طور پر مبہم زبان میں ہوتا تھا۔ ہیروڈوٹس نے فتح و کامرانی کے حصول کے بعد مقبرے پر نذر و چڑھاوا چڑھائے جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہیروڈوٹس قاری کو اپنے متعدد سفروں کی براہ راست تفصیلات بھی فراہم کرتا ہے۔ میسوپوٹامیہ (Mesopatamia) میں زراعت کے بارے میں اس کا بیان ملاحظہ ہو:

''جتنے بھی ممالک کے بارے میں ہمارے پاس معلومات ہے ان میں سے کہیں بھی اناج کی پیداوار اتنی کثرت سے نہیں ہوتی ہے، حالانکہ یہ ملک انجیر، زیتون کا درخت، انگور کی بیل اور اسی قسم کے دوسرے درختوں کو پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اناج کے معاملہ میں یہ اس قدر بارآور ہے کہ عام طور پر اس کی پیداوار دوسوگنی ہوتی ہے اور جب پیداوار بہتر ہو تو تین سوگنی بھی ہو جاتی ہے۔ گیہوں اور جو کے پودے کی پتیاں چار چار انگلیوں کے برابر چوڑی ہوتی ہیں۔ جہاں تک باجرہ اور تل کا تعلق ہے تو میں بتا نہیں سکتا کہ ان کی اونچائی کتنی ہوتی ہے۔ حالانکہ بابل میں ثمر آوری کے تعلق سے جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے میں ناواقف نہیں ہوں اور جوان لوگوں کے لیے ناقابل یقین ہے جنھوں نے اس ملک کا سفر نہیں کیا ہے۔''

اسی طرح ایرانیوں میں رائج آداب کے مختلف طریقوں کے بارے میں اس کے مختلف بیانات میں براہ راست مشاہدہ موجود ہے:

''جب گلیوں میں وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اگر وہ ہم رتبہ ہیں تو تمہیں بآسانی معلوم ہو جائے گا کیونکہ وہ بغیر کلام کیے ہوئے ایک دوسرے کے ہونٹوں کو چومتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں کم مرتبہ ہو تو اس کے گالوں کا بوسہ لیا جاتا ہے اور جب مرتبہ کا فرق بہت زیادہ ہوتو کم مرتبہ شخص خود کو زمین پر منہ کے بل جھکا لیتا ہے۔''(Book-I Section 134)

کبھی کبھی ہیروڈوٹس لوک روایات کو بھی بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ناقابل یقین حد تک مالدار تصور کیے جانے والے بادشاہ کروشس(Crocsus) اور ایتھینز آئین(Athenian Constituion) کے ایک بانی سولون(Solon) کے درمیان ہونے والی طویل گفتگو کا حوالہ دیتا ہے، اس کہانی کے مطابق کروشس کو یقین ہے کہ وہ زمین پر سب سے زیادہ خوش حال آدمی ہے لیکن سولون یہ کہتے ہوئے اعتراض کرتا ہے کہ اس کو اسی صورت میں سب سے زیادہ خوش حال شخص قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب اسے اس کا خاتمہ معلوم ہو، اس دلیل کی رو سے کسی شخص کے بارے میں اس کی موت کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خوشحال زندگی بسر کی۔

تھوسی ڈائیڈس(Thocydides) ماضی کے بارے میں کوئی نقطۂ نظر قائم کرنے اور اپنے ذرائع کے بارے میں بڑی خود آگہی سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''بہت سارے لوگ روایات کے بارے میں خواہ ان کے اپنے ہی ملک کی روایات ہوں، بس یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ بغیر کسی تنقیدی جانچ پڑتال کے جس شکل میں وہ محفوظ ہیں ہو بہو انھیں نقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح کم محنت اور کم کوششوں کے نتیجہ میں بازاری کام ہی سامنے آتے ہیں کیونکہ وہ آسانی سے ہاتھ آ جانے والی پہلی کہانی کو ہی قبول کر لیتے ہیں۔''

اس کے برعکس وہ اپنے عمل کو بہت سخت خیال کرتا ہے:

''ثبوتوں سے جو نتائج میں نے اخذ کیے ہیں، میرا یقین ہے کہ ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔''(Book-I, Section 20.21)

سالانہ ریکارڈز کو محفوظ رکھنے کا نظام روم میں صدیوں تک موجود تھا۔ Annales Maxim سچے وقائع کے طور پر معروف ان ریکارڈز کو مرتب کرنے اور محفوظ رکھنے کا کام پادری انجام دیتے تھے۔ وہ ہر سال معمور ہونے والے مجسٹریٹوں کے نام شامل کرنے اور اہم واقعات کے دوسرے متعلقات کو بھی تحریر کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ سبھی ممتاز گھرانوں میں تعزیتی خطبوں کی روایات رائج تھیں جنھیں بعد کے مورخین نے ان میں شامل کیا ہے۔

چونکہ اس قسم کی روایات اور ابتدائی مورخین جیسے پولیبیس(Polybius) کے کام محفوظ تھے، اسی لیے لیوی(Livy) اور ٹیسی ٹس(Tacitus) اپنے ذرائع کے بارے میں خاصے لاپروا نظر آتے ہیں۔ ٹیسی ٹس کا معاملہ تو یہ ہے کہ برسر اقتدار ممتاز گھرانوں کے بارے میں واقف اسرار ہونے کی اس کی حیثیت عملاً تسلیم شدہ ہے۔ تاہم اس کے یہاں بھی تحریری اور زبانی دونوں قسم کے ذرائع کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر Book-II Section 88 کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں اس نے واقعات کی اپنی مفصل تاریخ کو از سر نو لکھا ہے۔ اس میں اس نے جنگیں، سازشیں، ایوانی کارروائیاں، تعمیراتی سرگرمیاں اور معروف اقدامات کو شامل کیا ہے جنھیں اپنے وقائع یعنی سلطنت کے سال بہ سال واقعات کی تفصیل میں بڑی محنت سے جمع کیا تھا اور تھوسی ڈائیڈس(Thucydides) کی ہی طرح شاہی گھرانے میں سازشوں اور قتلوں کے بارے میں افواہوں کی چھان پھٹک کا ایک طریقہ مقرر کر لیا تھا اور بالخصوص جن افواہوں کو شرمناک خیال کرتا انھیں صراحت کے ساتھ رد کر دیتا تھا:

''ان تمام لوگوں سے میری درخواست ہے کہ جن کے ہاتھوں میں میرا کام پہنچے وہ حقیقی تاریخ کو ہی ترجیح دیں اور ان وحشی اور بعید از قیاس افواہوں پر دھیان نہ دیں جو پوری طرح داستانوں میں ذکر کیے جانے کے لائق ہیں۔''(Annales, Book-IV, Section 11)

Style 5.5 طرزادا

جن مصنفین کی ہم بات کر رہے ہیں انھوں نے واضح طور پر ممتاز اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے لکھا ہے حالانکہ ان کے کچھ مضامین زبانی طور پر بھی سنے گئے ہوں گے۔ درحقیقت ہر جملہ کو بڑی مہارت کے ساتھ اس قدر سنوارا گیا تھا کہ بسا اوقات ترجموں میں بھی وہ نکھار قائم رہ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تھوسی ڈائیڈس بڑا محتاط تھا۔ اس نے غور وخوض کرنے کا سنجیدہ انداز اختیار کیا اور قاری کو باخبر کر دیا کہ:

''یقیناً انھیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی نہ تو شاعر کی منظوم کہانی سے جس میں وہ اپنی کاریگری کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے اور نہ وقائع نگاروں کے مضامین سے جو حقیقت سے دور بس پرکشش ہوتے ہیں۔''(Book-I Section 21)

اس سنجیدہ انداز کے ساتھ اکثر اختصار بھی ضروری ہوتا ہے۔ شاید اس کی سب سے نمایاں مثال خود تھوسی ڈائیڈس کا ہی بیان ہے جب اس نے اتھینز میں جنگ کے دوسرے سال کے دوران طاعون کی وبا پھیل جانے کی تصویرکشی کی ہے۔ وہ بیماری کی علامت کا کتنا بہترین نقشہ کھینچتا ہے:

''اچھی بھلی صحت کے لوگوں کے سروں میں اچانک درد کا حملہ ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں لالی اور سوجن پیدا ہو جاتی ہے۔ جسم کے اندرونی حصے جیسے گلا یا زبان خون آلود ہو جاتے ہیں اور غیر فطری اور بدبودار سانس خارج ہونے لگتی ہے۔''(Book-II, Sect. 49)

طویل مدتی جنگ کے نتائج کی اس کی تصویرکشی بھی بڑی دلکش ہے:

''قیام امن کے بارے میں ریاستوں اور عوام کے جذبات کافی بہتر ہیں کیونکہ وہ خود کو آمرانہ ضروریات کے سامنے ٹکنے کی پوزیشن میں نہیں پاتے ہیں۔ جنگ نے روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل کو روک رکھا ہے، اور اس حد تک دشوار ثابت ہوئی ہے کہ بہت سارے لوگوں کے کردار کو ان کی قیمت کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔''

(Book-III, Section 82)

اور اسی طرح اس نے ان تقریروں کو بھی شامل کیا ہے جنھیں فن لے (1987:13) نے متن کا نہایت ہی دلچسپ اور دل فریب حصہ قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں خود تھوسی ڈائیڈس نے جو کچھ کہا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

''اس تاریخ میں جن تقریروں کے حوالے موجود ہیں ان میں سے کچھ تقریریں تو جنگ کے آغاز سے پہلے کی ہیں اور کچھ تقریریں دوران جنگ کی، کچھ کو میں نے بذات خود سنا تھا اور کچھ کو ادھر ادھر سے، ان تقریروں کو لفظ بہ لفظ یاد رکھنا دشوار کام تھا چنانچہ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں مقررین سے ان جملوں کو بلواتا ہوں جو میری رائے میں مختلف مواقع کے تقاضے کے مطابق تھے تاہم بلاشبہ ان تقریروں کے عام مفہوم کو ممکنہ حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔''(Book-I, Section 22)

شاید اس مثال سے یہ پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس قسم کی تقریروں کو مصنفین نے کس طرح استعمال کیا۔ کوریشین (Corinthians) سے متعلق اس تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو جنھوں نے اتھینز کے لوگوں کے خلاف اسپارٹا کے باشندوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوسی ڈائیڈس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتھینز کے باشندوں کی خوبیاں گنائی ہیں:

''اتھینز کے باشندے نئی چیزوں کے عادی ہیں۔ کسی چیز کے بارے میں تصور قائم کرنے اور اس تصور کو عمل میں لانے کے معاملہ میں ان کے یہاں عجلت پسندی ہے، جب کہ تمہارے پاس (اے اسپارٹا کے لوگو!) اپنے خیالات پر عمل کرنے کے لیے غیر معمولی ذہن ہے اور جسے نئی ایجادات کی شدید ضرورت ہے بھی مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو تم ہمت ہار بیٹھتے ہو۔ مزید یہ کہ ان کے اندر کسی چیز پر عمل کرنے کے معاملہ میں فوری آمادگی پائی جاتی ہے جب کہ تمہارے یہاں ٹال مٹول اور ڈھیل کا رویہ ہے۔ وہ کبھی گھروں میں نہیں بیٹھے، اور تم کبھی گھروں سے دور نہیں ہوتے، تمھیں ترقیوں سے دور رہ کر بھی ان چیزوں کے خطرہ میں پڑ جانے کا ڈر ستاتا رہتا ہے جنھیں تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔''(Book-I, Section 70)

اس قسم کے مختصر اور جامع بیانات لیوی (Levy) کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ بطور مثال، عوام اور ممبران ایوان کے درمیان تصادم کے بارے میں اس کا بیان ملاحظہ ہو۔(C.494-493 BCE):

''شہر میں خوف و ہراس کی لہر ہے، باہمی خوف کی وجہ سے سارے لوگ امید و بیم کی حالت میں ہیں۔ شہر میں رہ جانے والے لوگ ممبران ایوان کے تشدد سے

خوف زدہ ہیں جبکہ ممبران ایوان لوگوں سے دہشت زدہ ہیں۔"

اور ٹیسی ٹس اپنی Histories میں بالکل مختصر تصویر کشی کرتا ہے۔(Book-I, Section2)

"میں ایک ایسے عہد کی تاریخ بیان کرنے جارہا ہوں جہاں تباہیاں ہیں، خوفناک جنگیں ہیں، عوامی شورشیں ہیں اور یہاں تک کہ امن کے زمانہ میں بھی خوف ودہشت کا ماحول ہے۔"

5.6 تاریخی واقعات اور عمل کی تفہیم Understanding Historical Events and Process

ان ابتدائی مورخین کی اصل فکر یہ تھی کہ جو واقعات ان کی نگاہوں میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں ان کو فراہم کردیا جائے۔ان واقعات کا تسلسل بیان کرتے وقت وہ تھوڑی دیر بھی رک کر وجوہات پر غور نہیں کرتے ہیں۔واقعات کے سلسلہ میں مقامات اور وقت کا بڑا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس سے پرے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ واقعات کا ایک خاص تسلسل کیوں کر وقوع پذیر ہوا۔تاہم واقعات کو تشکیل دینے والے پس منظر کو دریافت کرلینا ممکن ہے۔ایک طرف قریب ترین معاشرتی ماحول اور اس کی سیاسی صورت حال سے قطع نظر مصنفین ان تصورات کے دائرہ میں ہی رہ کر کام کرتے ہیں جن میں غالباً اس دور کے تعلیم یافتہ لوگ بھی شریک تھے، ایسی چند مثالیں ہیں کہ یہ حضرات تقدیر کو بھی قبول کرلیتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مستقبل کے واقعات کے اشاریہ کے طور پر شگون کی کسی حیثیت کو قبول کرنا پڑتا ہے۔جب کہ دیگر مصنفین سنہرے ماضی سے انسانی قسمت (Human Fortunes) کے مسلسل انحطاط کے خیال کے ساتھ کام کرتے ہیں۔لیکن بہت سی مثالیں ایسی موجود ہیں کہ انسانی ایجنٹ کی اہمیت کی واضح قدر افزائی نہ سہی مگر اس کی جھلک ضرور مل جاتی ہے۔کبھی کبھی بہت ہی عام خیال انسانی ایجنٹ کی ناپائیداری کے اعتراف سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر ہیروڈوٹس کے اس بیان کو دیکھیں:

"جو شہر پہلے عظیم تھے ان میں سے اکثر آج غیر اہم ہو چکے ہیں اور اس طرح آج جو طاقتور شہر ہیں، پہلے وہ کمزور تھے، اسی لیے میں دونوں شہروں کی یکساں تفصیل لکھوں گا، کیونکہ تقدیر کی ہمیشہ ایک ہی حالت نہیں ہوتی ہے۔"(Book-I, Section 5)

شگون اور علامات (Signs) کے بارے میں عقیدہ اسی سے متعلق ہے۔ہیروڈوٹس اس کی وضاحت کرتا ہے:

"یہ اکثر ہوتا ہے کہ جب کسی ریاست پر یا کسی قوم پر بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے تو خطرات ظاہر ہوجاتے ہیں۔"(Book-VI, Section27)

درحقیقت شگون اور اس کے اثرات کا ذکر ان کے بیانیہ (Narrative) کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، ہم صرف ایک مثال کا حوالہ دیتے ہیں کہ ایرانی حکمراں زرتشت (Yerxes) کے لشکر نے ایک غیر معمولی اوصاف کی حامل (Prodigy) چیز دیکھی۔

"ایک گھوڑی نے خرگوش کو جنم دیا تھا، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ زرتشت کروفر اور شان وشوکت کے ساتھ یونان کے خلاف اپنی فوج کی قیادت کرے گا، لیکن دوبارہ اس جگہ تک لوٹ کر آنے کے لیے جہاں سے روانہ ہوا تھا، اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑے گا۔(Book-VII Section 57)

دیگر مصنفین جیسے تھوسی ڈائیڈس شاندار واقعات کو بغیر کسی تبصرہ کے بیان کردیتے ہیں۔مثال کے طور پر سسلی (Sicily) کے آتش فشاں پہاڑ اٹنا (Etna) کے پھٹنے کا ذکر کرتا ہے لیکن واقعات کے مقاصد سے اسے جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہے(Book-III, Section 116)۔کبھی کبھی خدائی قہر کی دہائی دی گئی ہے۔جیسے لیوی نے (Book IX, Section 29-30) میں تحریر کیا ہے کہ کیسے ایک اپیوس (Appius) نے غلاموں کو مخصوص مذہبی تقریبات کو انجام دینے کی ہدایت کی تھی۔وہ لکھتا ہے:

"نتیجہ کا بیان تعجب سے خالی نہیں ہے اور یہ سبق ہے کہ مذہبی تقریبات کے رائج طریقوں سے چھیڑ چھاڑ کے معاملہ میں لوگوں کو محتاط ہونا چاہیے کیونکہ پوٹیشین (Potetian) خاندان جس سے اپیوس کا تعلق تھا، اس کی بارہ شاخیں تھیں جو تیس جوانوں پر مشتمل تھیں۔تاہم ان میں سے ہر ایک اپنے گھروں کے تنہا چراغ تھے، ان کی پوری نسل ایک سال کے اندر اس طرح سمٹ گئی کہ پوتیسی کا نام تک ناپید ہوگیا۔اور یہ سب خدائی قہر کا نتیجہ تھا۔خود اپیوس بھی اس واقعہ کے چند برسوں بعد اپنی بصارت سے محروم ہوگیا تھا۔"

تاہم ان مصنّفین کو محض اوہام پرست قرار دے کر مسترد کر دینا بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ انسانی ایجنٹ اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں سمیت باقاعدہ تسلیم شدہ ہے۔ مثال کے طور پر ہیروڈوٹس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ایرانی حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے خطرناک بیڑے بنا کر اتھینز کے لوگوں نے جو جدوجہد کی وہ بہت ضرر رساں تھی۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ اگر اتھینز کے باشندوں نے امن کی خواہش ظاہر کی ہوتی تو جلد یا بدیر باقی یونان بھی ایران کے کنٹرول کے تحت آ جاتا۔ وہ لکھتا ہے:

''آج اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اتھینز کے باشندے یونان کے نجات دہندہ تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ صحیح معنوں میں ان ہی کے ہاتھوں میں انصاف کا میزان تھا جس طرف وہ اسے جھکا دیتے اسے ہی کامیابی مل جاتی تھی۔ اور اس طرح دیوتاؤں کے بعد انھوں نے ہی حملہ آوروں کو پسپا کیا۔''

اس حملہ کے بارے میں تھوسی ڈائیڈس کی رائے بڑی دلچسپ ہے (Book-II, Section 2)۔ وہ دلیل دیتا ہے کہ زرخیز علاقوں پر حملہ کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور اٹیکا (Attica) (وہ ریاست جس کی راجدھانی اتھینس تھی) حملوں سے محفوظ اسی لیے تھی کہ وہاں کی زمین بنجر تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ دوسری ریاستوں سے لوگ وہاں پناہ کی تلاش میں آتے تھے۔

دوسری سطح پر اس نے پیلوپونیشن (Peloponnesion) جنگ کی جو توجیہہ کی وہ جامع اور موثر ہے:

''میرے خیال میں اصل وجہ کو ہی عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ تھی اتھینز کی طاقت میں اضافہ جس کی وجہ سے لیس ڈایمن (Lacedacmon) (وہ ریاست جس کی راجدھانی اسپارٹا تھی) کو لاحق ہونے والے خطرے نے جنگ کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ (Book-I, Section 23)

ٹیسی ٹس (Tacetus) اکثر معاملوں کی چھان بین کے وقت وقائع کی اہم تفصیلات کی بابت بہت کم ہی نظر کرتا ہے۔ انہی شاذ و نادر مواقع میں سے ایک موقع وہ ہے جب اس نے قدیم ہم آہنگی (Pristine harmony) کو ریاست کے قانونی نظاموں کی تصویر کشی کے وسائل سے جداگانہ طور پر دیکھا ہے:

''ابتدائی دور میں انسان ایک زمانہ تک اس طرح زندگی بسر کرتے تھے کہ ان کے درمیان نفرت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ شرمندگی تھی نہ گناہ، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سزا اور پابندی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انعامات کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ہر اچھی چیز اپنی اصل خوبی پر قائم تھی۔ اور چونکہ لوگ اخلاقیات کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتے تھے اس لیے وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد تھے۔ لیکن جب لوگوں نے مساوات سے اپنا دامن چھڑانا شروع کر دیا۔ ضبط نفس اور انکسار و سادگی کی جگہ ذاتی خواہش اور تشدد نے لے لی۔ مطلق العنانی پروان چڑھی اور دیکھتے دیکھتے بہت ساری اقوام کے درمیان رائج ہوگئی۔ تو کچھ لوگوں نے مطلق العنانیت کے آغاز سے ہی یا پھر بادشاہوں سے اکتا کر قانونی ضوابط (Roles of Laws) کو ترجیح دی۔''

اور وہ (Annales Book VI, Section 22) میں جگہ جگہ تقدیر اور انسانی قسمت پر اس کے اثرات کو قیاس کرتا ہے۔

''دراصل دقیانوس دانشوروں کے درمیان اور ان کے شاگردوں کے درمیان متصادم نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یقین یہ ہے کہ بہشت کا تعلق بذات خود ہماری زندگی کے آغاز یا اختتام سے یا مختصراً نوع انسانی سے نہیں ہے اور اسی لیے بداعمال شخص کو خوش حالی اور اچھائی کے بجائے ہمیشہ رنج و غم ہی ملتے ہیں جبکہ اس کے بالکل برعکس بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ تقدیر اور واقعات کے درمیان بہر حال ہم آہنگی ہے تاہم یہ ادھر ادھر بھٹکتے ستاروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ہم آہنگی کا انحصار بنیادی عناصر اور فطری اسباب کے اتحاد پر ہے۔ یہ ہمارے اندر ہماری زندگی کے انتخاب اور اس کو برقرار رکھنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ اور جب انتخاب کا عمل ایک بار پورا ہو جاتا ہے تو پھر واقعات کا متعینہ تسلسل شروع ہو جاتا ہے۔''

5.7 تلخیص Summary

انسانیت کو ایک اہم عنصر قرار دینا ہی شاید ان ابتدائی مورخین کی مستحکم خدمات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی توجیہات محدود اور ان کے افکار تنگ ہوں تاہم وہ ہمیں معتبریت اور معقولیت (Authenticity and Plausibility) کے سوالات اٹھانے اور انھیں حل کرنے کی ابتدائی مثالیں ضرور فراہم کرتے ہیں۔ وہ ممکنہ تاریخی توجیہات کا بھی التزام کرتے تھے۔ ممکن ہے مخصوص وجوہات کی بنا پر ہمیں ان سے اختلاف ہو لیکن ان کی تلاش و جستجو مورخ کی سعی و کوشش کے حصہ کے طور پر صدیوں موجود رہے گی۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-34. IMC LIBRARY

5.8 مشقیں Exercises

(1) آپ یونٹ 3 کے بلاک I میں معروضیت اور ترجمانی کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائیڈس کی تحریر کردہ تواریخ کو معروضیت کے پیمانے پر کہاں رکھیں گے؟

(2) اس یونٹ میں زیر بحث تاریخ نویسی سے مؤرخین کے مقاصد کیا تھے؟

(3) اپنی تواریخ میں ان مؤرخین نے کیا طرز اختیار کیے ہیں؟ ایک نوٹ لکھیے۔

5.9 کتب برائے مطالعہ Suggested Readings

A.H.M. Jones (ed), A History of Rome through the Fifth Century selected Documentrs. vol.-1 (The Repbulic) and vol.2 The Empire (New York, Harper and Row 1968-70)

George Rawlinson (tr), The History of Herodotus (The Translation originally published during 1858-60)

Richard Crawley (tr). Thucydides, The History of the Pelopnnesian War (The Translation in 1910, Reprinted in 1952)

Alfred John Church and William Jackson Brodribb. (tr). The Annals and the Histories of Tacitus (Modern Library, 2003)

M.I. Finely, Ancient History:Evidence and Modes (London, Penguin, 1958)

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY * MANUU * HYDERABAD *
Accn. No MA-0415
Date 03.08.2013

Traditional Chinese Historiography | یونٹ6- روایتی چینی تاریخ نویسی

Structure	**ساخت**		
Introduction	**تعارف**		**6.1**
Background	**پس منظر**		**6.2**
Confucianism	کنفیوشس ازم	6.2.1	
The Imperial Bureaucratic State	خسروی نوکرشاہی ریاست	6.2.2	
Development of Historiographical Tradition	**تاریخ نویسی کی روایت**		**6.3**
The Annals	وقائع	6.3.1	
The Historical Records (Shi Ji) of Sima Qian	سماچین کے تاریخی دستاویز	6.3.2	
Dynastic Histories	خاندان سلاطین کی تواریخ	6.3.3	
The Later Imperial Period	شہنشاہی عہد کے بعد	6.3.4	
Historical Theories	**تاریخی نظریات**		**6.4**
Dynastic Cycle	شاہی سلسلہ	6.4.1	
Continuous History	مسلسل تاریخ	6.4.2	
Distinctive Features of The Traditional Historiography	**چین کی روایتی تاریخ نویسی کی خصوصیات**		**6.5**
Official History	سرکاری تاریخ	6.5.1	
Normative History	رہنمیانا تاریخ	6.5.2	
Standard Format	معیاری نمونہ	6.5.3	
Objectivity and Integrity	معروضیت اور دیانت داری	6.5.4	
Summary	**تلخیص**		**6.6**
Chronology of Major Dynasties	**اہم خاندان سلاطین کا تاریخ وار جدول**		**6.7**
Exercises	**مشقیں**		**6.8**
Suggested Reading	**کتب برائے مطالعہ**		**6.9**

Introduction | 6.1 تعارف

''میں نے دنیا کی قدیم روایات کو ایک جگہ جمع کیا جو کہ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ بلکہ کھو چکی تھیں۔ میں نے ماضی کے واقعات اور کاموں کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کی کامیابی اور ناکامی، ان کے عروج و زوال کے اسباب تلاش کیے۔ میری خواہش تھی کہ بہشت اور انسان سے متعلق تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کروں اور ماضی اور حال کی تبدیلیوں کی تہہ تک پہنچوں۔''

یہ عظیم مؤرخ نے سماچن کی تحریر ہے جو تاریخ کے حوالے سے چین کے پہلے اور عظیم کام The Shi Ji (Historical Records) کے اولین مصنف ہے۔ قبل مسیح (B.C) کی پہلی صدی میں سماچن نے چین میں تاریخ نویسی کی باقاعدہ اور مسلسل روایت کی داغ بیل رکھی۔ اس وقت دنیا کے کسی بھی حصہ میں شاید ہی اس کا متوازی کام ہوا ہو۔ اس روایت کے بارے میں دانشور ڈبلیو۔ ٹی۔ ڈی بیری (W.T.D.E Bary) نے لکھا ہے کہ یہ لوگوں کے ذریعہ محفوظ کردہ اپنے ماضی کے مسلسل اور سب سے زیادہ مکمل ریکارڈ کی نمائندگی کرتی ہے۔ چارلس گارڈنر نے چین کی روایتی تاریخ نویسی کے اپنے اولین مطالعہ میں لکھا ہے "کسی بھی دوسری قدیم قوم نے اپنے مکمل ماضی کے ریکارڈ کو اس قدر طول طویل، اتنا مسلسل اور واتنے صحیح طریقہ پر محفوظ نہیں کیا ہے"۔ جے کے فیر بینک نے بھی اسی انداز میں تحریر کیا ہے "اور لوگوں کو اپنے ماضی میں اتنی دلچسپی نہیں رہی ہے جتنی چینیوں کو۔ یہ ان کے لیے حال کا ایک ماڈل تھا اور انسانی معاشرہ کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کا ابتدائی ذریعہ تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس سے ان کو بیحد لگاؤ تھا۔ تاریخ کے اسٹیج پر ادکار بننے کا اتنا گہرا احساس یا اپنے بارے میں تاریخ کے مستقبل کے فیصلہ میں اتنی گہری دلچسپی لوگوں کے اندر دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔"

تاریخ نویسی چین کی قدیم روایت کا نہایت ہی اہم حصہ رہی ہے۔ یہ پوری طرح ان کے روایتی فلسفہ اخلاقیات اور آئین جہانبانی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ تاریخی طرز کے عظیم کام چین کی لٹریری روایت میں کثرت سے پڑھے جانے والے تھے اور انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس یونٹ کے بقیہ حصے میں چین کی عظیم تاریخ نویسی کی روایت کے اہم پہلوؤں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ بالخصوص ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کے اصل محرکات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ساتھ ہی تاریخ نویسی کی روایت کی تبدیلیوں یا ارتقاء اور خسروی چین میں مؤرخین کے درمیان بحث ومباحثہ کے اہم موضوعات کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ آخر میں اس روایت کی امتیازی خصوصیات کا بھی مطالعہ کیا جائے گا۔

6.2 پس منظر Background

اس سیکشن میں ہم کنفیوشس ازم کے بارے میں بحث کریں گے، جس نے چینی دانشوروں کی ذہنی دنیا تشکیل دی اور ماضی کے بارے میں اپنے تصورات قائم کرنے میں ان کی مدد کی۔ ان میں سے اکثر دانشور سرکاری تھے اور خسروی ریاست کا حصہ تھے۔

6.2.1 کنفیوشس ازم Confucianism

چھٹی صدی قبل مسیح کے ایک دانشور اور لو (LU) کی چینی ریاست کے سرکاری عہدیدار کنفیوشس کی تعلیمات اور بعد کی صدیوں میں اس کے پیروکاروں کے ذریعہ ان تعلیمات کی مزید تشریحات کو ہی کنفیوشس ازم کا نام دیا گیا۔ کنفیوشس ازم کی اصطلاح کو مشکل سے ہی ایک مذہب قبول کیا گیا تاہم چینی باشندوں کی عقل اور روحانی روایت پر اور ان کے سماجی اور سیاسی رویوں پر اس نے گہرا اثر چھوڑا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر جن پر ہم ابھی غور کریں گے، کنفیوشس ازم نے چینی تاریخ نویسی کی روایت پر مخصوص اور قومی اثرات مرتب کیے۔

چینی روایت میں تاریخ نویسی اور تاریخ کے مطالعے کی جو بڑی اہمیت ہوئی، کافی حد تک اس کا سہرا کنفیوشس ازم کے مخصوص بنیادی عناصر کے سر جاتا ہے۔ ان عناصر کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

- مسلک انسانیت (Humanism)
- ماضی کی تعظیم (Reverence for the past)
- اخلاقی تعلیمات پر زور (Emphasis on moral education)
- تمام چیزوں کے نظم وضبط سے دلچسپی (Concern with order in all things)

مسلک انسانیت Humanism

دراصل تاریخ نوع انسانی اورانسانی سرگرمیوں کے مطالعے کا نام ہے۔کنفیوشس کے نظریے کے مطابق مرکزی توجہ نوع انسانی پر دی جاتی ہے نہ کہ خدا یا کسی روحانی وجود پر۔انسان اپنے جیسے انسانوں سے کیسے تعلقات استوار کرتے تھے۔اس دنیا میں وہ کیسے اپنے معاملات کا نظم ونسق کرتے تھے۔وہ اپنے اندر اور دوسروں کے اندر کیسے اقدار پیدا کرتے تھے۔کنفیوشس اور اس کے فلسفہ کی اصل محور یہی چیزیں ہیں۔انسانی معاملات میں گہری دلچسپی قدرتی طور پر تاریخ میں دلچسپی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

ماضی کی تعظیم Reverence of the past

حالانکہ کنفیوشس سے پہلے بھی چینیوں میں ماضی کا احترام موجود تھا جس کا اظہار ان کے اس عمل سے ہوتا ہے کہ وہ بالکل ابتدائی زمانے سے ہی اپنے آباواجداد کی عبادت کرتے تھے۔تاہم کنفیوشس نے اس روایت کو فلسفیانہ بنیاد عطا کی۔بڑھتی ہوئی سیاسی انارکی اور مسلسل تبدیلی کے ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے کنفیوشس ماضی کو ہی انسانی بہبود اور نظم وضبط کا سنہری دور خیال کرنے لگا تھا۔اس کا یہ یقین تھا کہ ماضی میں اخلاقی، سیاسی اور سماجی رویوں کے ایسے نمونے مل سکتے ہیں جن سے ہمیں بگاڑ اور بدنظمی کے خاتمہ میں مدد مل سکتی ہے اور معاشرہ کی تعمیر از سرنو کی جاسکتی ہے۔

اخلاقی تعلیمات پر زور Emphasis on moral education

کنفیوشس ازم کے مطابق پورے سماج میں انسانی بہبود اور ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے درکار بنیادی چیز حقیقی طور پر بااخلاق انسانوں کا وجود ہے۔حالانکہ کنفیوشس ازم کے اندر غالب رجحان یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ہی سلیم الفطرت ہوتا ہے۔لیکن حقیقی یا پارسا افراد (Men of virtue) سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ عملی طور پر اپنے اندر تعلیم کے ذریعہ بہتر خوبیاں پیدا کریں گے۔مختلف حالات کے تحت مناسب رویہ کیسے اپنایا جائے، صحیح اور غلط کا فیصلہ کیسے کیا جائے، یہ چیزیں ابتدائی طور پر مطالعے کے ذریعہ اور انسانوں کے اعمال، ماضی اور حال سے مناسب سبق حاصل کرکے ہی سیکھی جاتی ہیں۔پانچ مقتدر چیزیں (Five Classics) ایسی ہیں جن کے بارے میں جاننا ہر تعلیم یافتہ فرد کے لیے لازمی خیال کیا جاتا تھا اور یہ اتفاق نہیں ہے کہ ان میں سے دو (The Classic of history) اور (Spring and Autumn Annals) لازمی طور پر تاریخ کے ہی کام ہیں۔

نظم ونسق سے دلچسپی Concern with order

تاریخ کا مطالعہ عام طور پر صرف انسانی مسائل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایسے نظم ونسق اور معانی کی تلاش کو بھی محیط ہے جن کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کا ارتقاء ہوا ہے۔چینی تاریخ نویسی کی روایت میں ان چیزوں کی واقفیت نے ہی نظم ونسق اور اس کی درجہ بندی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے تاریخ کے جنون کو بڑھاوا دیا۔ساتھ ہی اسباب اور اثرات کو سمجھنے اور انسانی تاریخ کی گردش کے دوران اپنے کو بار بار دہرانے والے نمونوں کی شناخت کی کوششوں میں بھی تیزی پیدا کی۔چونکہ کنفیوشس ازم کی اصل فکر یہی ہے کہ حال میں نظم ونسق کو قائم کیا جائے اور اسے چلایا جائے۔چنانچہ اس طرح اس نے اس طریقہ کو بھی متاثر کیا جس طریقہ پر ماضی کا تصور کیا گیا۔

6.2.2 خسروی نوکرشاہی ریاست The Imperial Bureaucratic state

چین میں تاریخ نویسی کا کام دانشوروں نے انجام دیا۔یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن روایتی چین کے بارے میں جو امتیازی بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ دانشوران بھی سرکاری افسر تھے۔حالانکہ اپنی تواریخ تحریر کرتے وقت حقیقی طور پر وہ کسی سرکاری عہدہ پر فائز نہ تھے، تاہم وہ اس طور پر سرکاری ضرور تھے کہ یا تو وہ ریٹائر

ہو چکے تھے یا سرکاری عہدوں کے خواہشمند تھے۔چینی تاریخیات کے ماہر ایٹین بلیز (Etienne Balasz) نے یہی تحریر کیا ہے۔بلیز ہی نے چینی تاریخ نویسی کی مختصر تعریف یوں بیان کی ہے'' سرکاری عہدیداروں کی تحریر کردہ تاریخ سرکاری عہدیداروں کے لیے۔''

اس کا عملاً مطلب یہ ہے کہ تاریخ نویسی اس شہنشاہی ریاست کے مسائل کو ہی اجاگر کرتی ہے، سرکاری درجہ کے یہ دانشوران جس کی خدمت کے لیے معمور تھے۔اس طرح شہنشاہ اور اس کے حکمراں گھرانے یا شاہی سلسلہ کے جواز کو ثابت کرنا ہی اہم مسئلہ تھا۔اعلیٰ خوبیوں کے حامل افراد کی حکومت (Rule by Virtue) پر کنفیوشسس ازم کے زور کا مطلب یہ تھا کہ ایک شہنشاہ کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حکومت کرنے کے اپنے حق کو اقتدار پر اپنے پس پردہ قبضہ کو برقرار رکھنے کی بنیاد بنائے۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کیسے ایک شہنشاہ یا شاہی سلسلہ برسر اقتدار آیا بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اچھی طرح مروجہ کنفیوشسس ازم کے اصول اور روایت کے مطابق وہ ہمیشہ اقتدار پر بنے رہنے کا جواز پیش کریں۔لہٰذا پچھلے خاندان سلاطین یا پچھلے حکمرانوں کی تاریخ اس طرح لکھنا کہ موجودہ حکمراں کے وقار میں اضافہ ہو اور جانشینی کے دور (Succeeding ages) میں ان کی شان وشوکت کو یقینی بنادینے کا سبب ہو، مؤرخ کے لیے اہم مسئلہ تھا۔تاریخ کے بڑے کام، عام طور پر حکمرانوں کی امداد یافتہ تھے یا انہوں نے ان کی نگرانی کی تھی۔

موجودہ حکمرانوں کے حق میں اس تعصب کے باوجود بلیز (Balasz) کے مطابق چینی تاریخ نویسی اکثر ایک درجہ تک معروضیت کا ثبوت دیتی ہے جو کہ ان حالات میں غیر معمولی تھا۔گیارہویں صدی کے ایک عظیم تاریخی کام میں مذکورہ اس قصہ سے کافی حد تک یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اگر سرکاری تاریخ نویس مصمم عہد کر لیتے تو وہ اپنے فیصلہ کی آزادی کو محفوظ رکھ سکتے تھے:

شہنشاہ تائی تسونگ (T'ae-tsung) (ٹینگ خاندان) نے شاہی محتسب چوسوئی لیانگ (Ch'u sue-liang) سے کہا تھا جناب چونکہ کام اور کارروائی ہر چیز کے بارے میں دفتر میں موصول ہونے والے روزنامچوں کے ذمہ دار ہیں (شہنشاہ کی سرگرمیوں کے جسے شاہی مؤرخین تیار کرتے تھے) کیا میں دیکھ سکتا ہوں کہ آپ نے کیا لکھا ہے؟ سوئی لیانگ نے جواب دیا: تاریخ نویس لوگوں کے اور حکمراں کے اقوال اور اعمال کو لکھتے ہوئے ان تمام چیزوں کو بھی تحریر کردیتے ہیں جو اچھی یا بری ہوں، وہ ایسا اس امید میں کرتے ہیں کہ حکمراں کوئی برائی نہیں کرسکے،لیکن یہ تو عجیب وغریب بات ہوئی کی حکمراں خود یہ دیکھے کہ اس کے بارے میں کیا کچھ لکھا گیا شہنشاہ نے کہا! اگر میں کوئی ایسا کام کروں جو اچھا نہ ہو تو تم اسے بھی لکھوگے؟ سوئی لیانگ نے جواب دیا، میرا کام تو بس قلم چلانا ہے میں کیسے ہمت کرسکتا ہوں کہ اسے نہ لکھوں؟ ایک شاہی مؤرخ لیوچی (Liu Chi) آگے لکھتا ہے کہ حالانکہ سوئی لیانگ اس حکایت کو لکھ نہیں سکا تاہم ریاست میں ہر کسی کو پتہ ہے کہ شہنشاہ نے کیا جواب دیا تھا۔اس نے کہا تھا'' ٹھیک ہے۔''

اس حکایت سے مؤرخین کے ایک دوسرے مسئلہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ حکمرانوں اور سرکاری عہدیداروں دونوں کو سکھانے کا کام بھی کرتے تھے اس کے لیے وہ ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مطلوب اطلاعات ان کو فراہم کرتے تھے اور ماضی کے تجربات سے سبق اخذ کرتے تھے۔اس معروف تاریخی کام کا نام جس سے اس اقتباس کو لیا گیا ہے'' حکومت کی مدد کے لیے معاون آئینہ'' (Comprehensive Mirror for the aid of Government) ہے۔ریاستی مسائل کا دائرہ جس قدر بعد کے شہنشاہی عہد تک پھیلا اسی قدر مؤرخین کے قلم کے لیے مناسب خیال کیے جانے والے معاملات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔یہی وجہ ہے کہ بعد کی تاریخ کے بہت سے کام حقیقی طور پر ضخامت اور خیال کی وسعت کے اعتبار سے مکمل ہیں، معلومات سے پُر ہیں۔

6.3 تاریخ نویسی کی روایت کا ارتقاء Development of the Historiographical Tradition

اب ہم ماقبل جدید چین میں صدیوں پہلے تاریخ نویسی کی روایت کے ارتقاء کا سراغ لگائیں گے۔

6.3.1 وقائع : The Annals

چینی لفظ'' شی'' (Shi) جس کے معنی تاریخ کے ہیں درحقیقت ان شاہی کاتبوں سے متعلق ہے جو فلکیاتی واقعات یا حکمرانوں کے لیے اہم خیال کئے جانے

والے دیگر معاملات کو تحریر کرتے تھے۔ تاریخ نویسی کی ابتدائی شکل ان ہی کاتبوں کے محفوظ کردہ شاہی واقعات کی ترتیب وار دستاویزات پر مشتمل تھی جو وقائع (Annals) کے نام سے معروف ہے۔ ان کے زمانے کا تعین ایسٹرن توو کے عہد سے کیا جاتا ہے (جو تقریباً آٹھویں صدی سے تیسری صدی قبل مسیح تک محیط ہے) جبکہ بالکل ابتدائی محفوظ مثال ''لُوْ'' (Lu) کی ریاست سے ملتی ہے جس سے کنفیوشس وابستہ تھا۔ وقائع میں اختیار کیا گیا تحریر کا اسلوب نہایت ہی مختصر تھا۔ جن میں اہم واقعات کو صرف شامل کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر 715 قبل مسیح کے ایک مخصوص سال کے بارے میں صرف ایک لفظ ''وباء'' درج ہے۔ ان وقائع کی بنیاد پر ہی مؤرخین نے منفرد حکمرانوں کے دورِ حکومت کے مکمل دستاویزات مرتب کیے، جو اصل دستاویزات (Verified Records) کے نام سے معروف ہیں۔ پوری شفافیت اور تسلسل کے ساتھ چینی تاریخ کے اکثر حصوں پر مشتمل یہ ''اصل دستاویزات'' تاریخی معلومات کا قیمتی اور قابل بھروسہ ذریعہ ہیں۔

6.3.2 سماچن کے تاریخی دستاویزات — The Historical Records of Sima Qian

بلاشبہ سماچن (متوفی 85 قبل مسیح) ماقبل جدید چین کا عظیم مؤرخ تھا، جس نے پہلے ہان شاہی خاندان کے عہد میں اپنی شاہکار کتاب ''تاریخی دستاویزات'' (Shi Ji) Historical Records تصنیف کی۔ سماچن ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے عہد رفتہ سے لے کر اپنے زمانے تک چین کی تاریخ تحریر کی اور اس نے وقائع کے سانچے کی حدود کو توڑ دیا۔ مزید یہ کہ تاریخی کاموں کے لیے ایک نئی نہج قائم کی۔ جدید عہد کے مؤرخین تک نے اس سانچے کو اختیار کیا ہے۔ اس سانچے کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ وقائع یک موضوعی تحقیقی مقالہ سوانح حیات۔

دراصل تاریخی دستاویزات (Historical Records) پانچ ڈھانچوں پر مشتمل ہے، لیکن جن دو بنیادی نئی چیزوں کا سماچن نے متعارف کرایا اس کا ایک حصہ تو موضوعاتی مضامین یا ایک موضوعی تحقیقی مقالوں پر مشتمل ہے اور دوسرا سوانح حیات پر۔ تحقیقاتی مقالوں کے حصوں میں مذہبی روایات اور میوزک، کلینڈر، علم نجوم اور فلکیات، نہریں اور ندیاں اور باٹ اور میزان جیسے موضوعات شامل ہیں۔ باٹ اور میزان والا حصہ صحیح معنی میں اقتصادیات پر بھرپور مقالہ ہے۔ بعد کی صدیوں میں مونوگراف کے سیکشن میں رفتہ رفتہ یہ تبدیلی آئی کہ کافی حد تک مذہبی رسوم و رواج اور علم نجوم جیسے سری موضوعات سے ہٹ کر ان موضوعات کو اختیار کیا جانے لگا جو عملی طور پر انتظامیہ سے متعلق تھے (جیسے قانون، نظم و نسق، صنعت، آب رسانی اور نقل و حمل وغیرہ) تاہم ایک موضوعی تحقیقاتی مقالوں کو تاریخ کے اکثر و بیشتر ہر بڑے کام میں اہمیت حاصل رہی۔ سماچن نے سوانح حیات پر بھی ایک سیکشن شامل کیا ہے جس میں وہ صرف نمایاں شخصیات کو ہی نہیں بلکہ ایماندار افسران، ظالم افسران، پاکدامن بیوائیں جیسے لوگوں کے گروپ کو بھی جگہ دیتا ہے۔ تاریخی کاموں میں یہی ایک سیکشن ہے جس میں ہمیں غیر ملکی لوگوں کی سرگزشت بھی ملتی ہے۔

نہ صرف ڈھانچہ سے بلکہ سماچن نے جو طریقہ اختیار کیا، بعد کے مؤرخین نے اہم معاملوں میں اس طریقہ سے بھی استفادہ کیا۔ اس نے ان ذرائع کی اصل کی ایماندارانہ نقل تیار کرنے کا عمل شروع کیا جن وہ بھروسہ کرتا تھا اور جہاں کہیں ایک ہی موضوع یا واقعہ کے سلسلہ میں متعدد روایتیں تھیں یا مختلف روایتیں تھیں اس نے ان ساری روایات کی نقل تیار کی اور یہ حق قاری کو دیا کہ وہ اپنے آپ فیصلہ کرے۔ اس نے تحریر کے لیے وقائع کے تحت اور رسمی طریقہ سے پیچھا چھڑا کر اپنا صاف اور واضح طریقہ رائج کیا، اس کے بعد کے عظیم مؤرخین بان گو (Ban Gu) نے اسے زبردست خراج عقیدت پیش کی۔ اس عظیم مؤرخ کے بارے میں وہ رقمطراز ہے:

''تقریریں کرتا ہے مگر زیادہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتا۔ وہ بالکل سادہ ہے مگر اجڈ گنوار نہیں ہے۔ اس کی تحریر براہ راست ہے، اس کے حقائق بولتے ہیں وہ کسی چیز کو جھٹلاتا نہیں ہے اور برائی کو برائی قرار دینے سے احتراز نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر ایک حقیقی دستاویز ہے''۔

6.3.3 خاندان سلاطین کی تاریخ — Dynastic Histories

چینی تاریخ نویسی کے پورے خزانے میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر ''24 معیاری تواریخ'' کا مجموعہ ہے۔ ہر معیاری تاریخ بنیادی طور پر ایک مخصوص شاہی خاندان اور اس کے دور کی تاریخ ہے۔ جسے اس کے بعد کے جانشین خاندان نے تحریر کیا ہے، جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا گیا ہے کہ اپنے پیش رو خاندان کی تاریخ مرتب کرانے میں پس پردہ نئے خاندان کا اپنا مفاد ہوتا تھا، چونکہ اس طرح وہ اپنی تخت نشینی کے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن بلاشبہ اس عمل کے ذریعہ عوام ایک تمدن کے بارے میں ایک منفرد تاریخی دستاویز ابھر کر سامنے آیا جو اپنے مشتملات کی جامعیت اور صلابت کے لحاظ سے غیر معمولی ہے، حالانکہ سماچن کی Historical Records

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU
IMC LIBRARY
Hyderabad-34.

کو روایت اور احترام کے لحاظ سے اولین معیاری تاریخی قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ صرف ایک شاہی خاندان کی تاریخ پر ہی مشتمل نہیں ہے۔ خاندان سلاطین کی پہلی حقیقی تاریخی پہلی صدی عیسوی کے مؤرخ بان گو کا تخلیقی کام تھا۔ جس میں ان کے والد بان بیاؤ (Ban Biao) اور اس کی بہن بان ژاؤ (Ban Zhao) بھی شریک تھے۔ متاخر (Later) بان کے عہد میں موجود بان گو نے متقدم بان خاندان کا تاریخ لکھنے کی کوشش کی جس میں اس نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ سا چن کی نہج کو ہی اختیار کیا، ابتدا میں اس کام کو سرکاری امداد نہیں ملی۔ بلکہ شہنشاہ ژیانگ ژونگ (Xian Zong) کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ وہ نجی طور پر یہ تاریخ مرتب کرنے کا کام کر رہا ہے تو اسے گرفتار بھی کرلیا گیا تاہم اس کے جیل جانے کے بعد اس کی بہن نے اس کی سفارش کی اور ایک حد تک مکمل اس کام کے مسودہ کو مطالعے کے لیے پیش کیا۔ جب شہنشاہ کو اس پروجیکٹ کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو اس نے بان گو کو حکم دیا کہ وہ اپنے کام کو مکمل کرے۔ بان نے اس کام کو اگلے بیس برسوں میں مکمل کیا۔ بعد کے خاندان سلاطین کی تواریخ اکثر و بیشتر سرکاری امداد یافتہ تھیں۔

تیسری صدی عیسوی میں بان خاندان کے زوال کے بعد شہنشاہیت بار بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی اور شاہی تخت کی جانشینی واضح نہیں رہی۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ چین کی تاریخ کی لامرکزیت کے ان ادوار میں بھی اقتدار کے لیے باہم برسرپیکار مختلف سلطنتوں میں خاندان سلاطین کی تواریخ تحریر کیے جانے کی روایت برقرار رہی۔ اسی لیے تسلیم شدہ معیاری تواریخ کی تعداد چوبیس ہے۔ حالانکہ متحدہ چینی شہنشاہیت کے دور میں حکومت کرنے والے خاندانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اگرچہ 1911 میں شہنشاہیت مکمل طور پر ختم ہوگئی لیکن جانشین جمہوری حکومت بھی معیاری تواریخ کی روایت کو جاری رکھنے کے لیے کوشاں رہی اور آخری چی شاہی خاندان کی تاریخ لکھی گئی۔ تاہم اس کام کو عام طور پر چوبیس معیاری تواریخ میں تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔

6.3.4 شہنشاہی عہد کے بعد — The later Imperial Period

عظیم بان خاندان کی تباہی کے 350 برسوں سے زیادہ وقفہ کے بعد چین 689 صدی عیسوی میں سوئی (Sue) خاندان کے بانی شہنشاہ کے زیر نگیں ایک بار پھر متحد ہوا۔ بعد ازاں تانگ (Tang) خاندان کے خاتمے کے بعد جنگ کے پچاس برسوں کو چھوڑ کر چینی شہنشاہیت کا اتحاد بیسویں صدی تک تقریباً ایک ہزار سال تک کم و بیش مستقل قائم رہا۔ چین میں تاریخی نویسی کی روایت پر اس کا بھی اثر پڑا۔ اسی لیے تاریخ کے بڑے کاموں کو اکثر و بیشتر شاہی حکمرانوں کی امداد حاصل رہی۔ نتیجتاً یہ مفرد دانشوروں کے کام نہ ہو کر تاریخ نویسی کے شاہی ادارہ کے زیر اہتمام منظم مؤرخین کے کام بن گئے۔ درحقیقت ان کاموں کو تاریخی معلومات کی سرکاری تالیف قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ عظیم قاموسی تواریخ کا عہد تھا جس میں مختلف اداروں کی تواریخ میں اتنی وسعت اور جامعیت ہے کہ معیاری تواریخ کے مونوگراف سیکشن میں شامل موضوعات کو انہوں نے کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ ان قاموسی تواریخ نے ایک ایسے عہد میں دانشوران اور افسران کی ضرورت کو پورا کیا جب ریاستی امور میں پیچیدگی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سرکاری امور انتظامیہ کی خدمت بجالانے کے لیے مقابلہ جاتی سول سروس امتحانات کے اس دور میں اسکالروں کے لیے ان کی افادیت میں اس طور پر بھی اضافہ ہوا کہ ایک مخصوص موضوع سے متعلق معلومات ایک ہی جگہ اکٹھی مل جاتی تھی۔

شہنشاہیت کے بعد کے عہد میں تاریخ کے بہت سارے کام غیر دلچسپ اور کسی حد تک نوکر شاہی نوعیت کے ہونے کے باوجود تانگ اور بالخصوص سانگ کا عہد تاریخ نویسی کے میدان میں علمی چھان بین کے عہد تھے۔ دانشوروں اور عالموں نے تاریخ نویسی میں سختی اور رسمیت کا مقابلہ کرنے اور نئی راہیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔

چین میں تنقیدی تاریخ نویسی کا پہلا کام تانگ شاہی خاندان کے فاضل لیوزیجی (Liu Zhiji) کا تھا۔ اس نے ''تاریخ پر'' (On history) نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس نے براہ راست یہ سوال اٹھایا کہ تاریخ کیسی تھی اور کیسے لکھی جانی چاہیے۔ سانگ عہد کے عظیم مؤرخ سیما گوانگ (1086-1019) نے کافی حد تک اس سوال پر بحث کی کہ تاریخ نویسی کے دوران ثبوتوں کے اختلاف کے مسئلے کو کیسے حل کیا جائے۔ حالانکہ اس نے براہ راست شاہی تاریخ کی نہج پر اعتراض نہیں کیا لیکن اس نے اپنی کتاب ''حکومت کی مدد کے لیے مثالی آئینہ'' (Comprehensive Mirror for the Aid of Government) تصنیف کرنے میں اس کی حدود سے فرار اختیار کی۔ اس عظیم کام نے چین کی تاریخ کے 1362 برسوں کی تاریخ وار تفصیل فراہم کی جو کہ 403 صدی قبل مسیح سے 959 صدی عیسوی تک محیط ہے۔ یہ کتاب شہنشاہی عہد کے بعد کی تاریخ کا نہایت ہی مؤثر کام ہے۔ دیگر مؤرخین نے بھی شہنشاہی ادوار مختلف حصوں میں تقسیم کرنے پر تاریخ کی افادیت پر سوال اٹھایا اور یہ بھی محسوس کیا کہ سیما گوانگ اس سلسلہ میں بہت دور تک نہیں گیا۔ ان مؤرخین نے اس خلیج کو موضوعاتی تواریخ اور اداراجاتی تواریخ لکھ کر بھرنے کی کوشش کی۔

سونگ عہد کے مؤرخین نے خاص طور پر ماضی کے گمشدہ نظم ونسق کو سمجھنے اور تاریخ سے اخلاقی سبق اخذ کرنے میں خاصی دلچسپی لی۔ یہی وہ عہد ہے جب کہ چین میں بودھ مت کے عروج کے زمانے میں کافی حد تک ماندہ کنفیوشس ازم کا وقار بحال ہو رہا تھا۔ اس پوری صورتحال کو لوزکین (Lu Ziqian) نے بہتر طریقہ سے واضح کیا ہے وہ رقمطراز ہے:

''اکثر لوگ جب تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو عام طور پر مختلف عہدوں کی زمانی ترتیب دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ ترتیب میں ہیں، جب وہ بدنظمی کو دیکھتے ہیں تو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی یہی صورتحال ہے، ایک حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور دوسری حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، لیکن کیا یہی تاریخ کا حقیقی مشاہدہ ہے؟ تمہیں خود کو اس دور میں لے جانا چاہیے، مشاہدہ کرنا چاہیے کہ کون سی چیزیں مفید ہیں اور کون سی خطرناک اور زمانے کی بدنصیبی اور بدبختی پر غور کرنا چاہیے اور پھر کتاب بند کر کے سوچو، اور یہ تصور کرو کہ خود تم وہ حقائق در پیش ہیں اور فیصلہ کرو کہ اس صورتحال میں کیا طرز عمل مناسب ہے۔ اگر تم تاریخ پر اس انداز سے غور کرتے ہو تو تمہاری معلومات بڑھے گی اور علم میں اضافہ ہوگا۔ اور اپنے مطالعے کا صحیح فائدہ تمہیں ملے گا''۔ سونگ عہد کے بعد چینی شہنشاہیت کے مؤرخین میں علمی چھان بین کی یہ وسعت ہمیں نہیں ملتی۔ تاہم محنت اور باریک بینی کے ساتھ تاریخ نویسی اور تاریخی کاموں کی ترتیب اور درجہ بندی کی روایت جاری رہی۔ خاص طور پر معاصر مسائل کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک ٹھیک حل تلاش کر لینے کے لیے تاریخ اور تاریخی قیاس کا استعمال چینی فاضلوں اور دانشوروں کے لیے بڑا موضوع بنا رہا اور جدید عہد تک یہی صورتحال رہی۔

6.4 تاریخی نظریات Historical Theories

تاریخ نویسی کا عمل ہمیشہ کسی نہ کسی نظریاتی بنیاد پر ہی سامنے آیا۔ یہاں تک کہ مکمل غیر جانبداری کا دعویٰ کرنے والے مؤرخین بھی اپنے مواد کو مرتب کرنے کے لیے عام اصولوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کا عمل بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں ہم چینی تاریخ نویسی کی روایت کی چند نظریاتی بنیادوں کے بارے میں بحث کریں گے۔

6.4.1 شاہی سلسلہ Dynastic Cycle

روایتی تاریخ نویسی پر شاہی دور کا تصور حاوی رہا۔ چینی روایت کے مطابق چین کا پہلا حکمراں خاندان زیا (Xia) تھا جسے شانگ خاندان نے تخت سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد ژاؤ (Zhou) خاندان نے تخت پر قبضہ کر لیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ اس طرح چینی یکے بعد دیگرے خاندان سلاطین کے عروج وزوال کو واضح متعینہ نمونے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ شاہی سلسلہ کا نظریہ روایتی مؤرخین کے لیے دو طریقے سے مفید ثابت ہوا، ایک تو یہ کہ اپنے ماضی کو باقاعدہ حصوں میں تقسیم کرنے میں ان کو آسانی ہوئی، کیونکہ چند خاندانوں نے تین سو سال سے زائد عرصے تک حکومت کی جب کہ کچھ خاندان صرف چند دہائیوں تک ہی تخت پر برقرار رہ سکے۔ دوسرے شاید زیادہ اہم یہ کہ شاہی سلسلہ تاریخ نویسی کے اخلاقی مقاصد کا پابند رہا۔ شاہی خاندان کے عروج وزوال کو انفرادی حکمرانوں کی ذاتی اخلاقی خوبیوں کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ کسی شاہی خاندان کے بانی حکمراں یا حکمرانوں کو ہمیشہ بڑی دانشمندی اور صلاحیت کے حامل افراد کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جو بدنظمی کا خاتمہ کرتے تھے اور عام انسانی بہبود کے ایک عہد کی بنیاد رکھتے تھے۔ اخیر زمانے کے ان حکمرانوں کو کمزور اور غیر مؤثر افراد تصور کیا گیا جو کہ اپنے آپ میں ہی مست رہتے تھے اور جنہوں نے ریاست کے امور کو بدنظمی کا شکار بنا دیا۔ اس طرح موجودہ خاندان کا بانی حکمراں (جو اپنے پیش رو خاندان کی تاریخ لکھے جانے کے عمل کی نگرانی کرتا تھا) مثبت شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس نے گڑبڑی اور بدنظمی کا خاتمہ کیا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اپنے نااہل پیش رو سے تخت چھین کر حکومت کرنے کے لیے اسے تائید ربانی حاصل ہوئی اور پورا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ یہ حکمرانوں کے لیے کھلی آگاہی تھی کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں وہ ایماندار رہیں اور حکومت چلانے کے اصول اور تسلیم شدہ روایات کی پیروی کریں ورنہ کسی اور کو حکومت کرنے کے لیے تائید ربانی حاصل ہو جائے گی۔

فیربینک (Fair bank) کے مطابق چینی تاریخ کے بنیادی محرکات کو سمجھنے کے لیے شاہی سلسلہ بڑی اڑچن ثابت ہوا، صرف قلیل مدتی تبدیلیوں پر ہی توجہ

مرکوز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت ہی بنیادی اور طویل مدتی تبدیلیاں واضح طور پر سامنے نہیں آپائیں جو کہ چینی معاشرہ میں وقوع پذیر ہورہی تھیں۔ ٹھیک اسی طرح تاریخ کے اعادہ پر ہی زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی تبدیلی کے امکان کو ہی مسترد کردیا گیا، اس طرح ماضی کی ڈور سے بندھے ہوئے سیاستداں اور دانشور حال کی الجھنوں کو بھی سلجھانے کے لیے پچھلے زمانے میں ہی سراغ تلاش کرتے رہے، کیونکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ موجودہ مسئلہ کی نظیر پچھلے دور میں موجود ہے۔ اس تصور نے ایک بیمار ذہنیت کو جنم دے دیا۔ بالخصوص جب کہ 19ویں صدی میں چین کو بالکل نئے اور بالکل الگ انداز کے مسائل درپیش تھے، لیکن یہی وہ وقت ہے جب فیر بینک تسلیم کرتا ہے کہ شاہی سلسلہ بہت ہی محدود افادیت کا حامل تھا کیونکہ خود عظیم شاہی خاندانوں کے ادوار میں غیر ملکیوں کی جانب سے درپیش چیلنجوں کی صورت میں ان کی انتظامی اور اقتصادی کمزوری بڑی تیزی سے ظاہر ہورہی تھی اور ایک بحرانی دور پیدا ہوگیا تھا جس میں انقلاب اور بیرونی حملہ کا بھی اندیشہ ہونے لگا تھا۔

6.4.2 مسلسل تاریخ — Continuous History

شاہی سلسلہ کی بنیادوں پر روایتی چین میں تنقید ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ بالخصوص ٹانگ اور سوانگ کے عہد میں مؤرخین نے اس تنگ نظری کی مخالفت کی اور اس سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ بعض مؤرخین جیسے سیما گوانگ نے شاہی بنیاد کی کھل کر مخالفت کی لیکن اس کے کام کا دائرہ کسی ایک شاہی خاندان سے بلند تر تھا۔ جب کہ زینگ سو(Zheng qiao) نے شاہی تواریخ لکھنے کا عمل شروع کرنے کے لیے ماقبل مؤرخ بان گو کی براہ راست تنقید کی اور مسلسل تاریخ کے تصور کی کھلم کھلا تائید کی۔ یان شو(Yuan shu) نے ایک موضوع کو لے کر اس کے بارے میں شروع سے آخر تک لکھنے کا طریقہ شروع کیا اور اپنے طریقہ میں اسنے شاہی بنیاد کی مقرر کردہ حدود کی پروانہیں کی۔ ماڈوان لن(Maduan lin) نے ایک قسم کا سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ ''شاہی بنیاد پر سیاسی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، لیکن اداروں کی تاریخ میں یہی طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عہد میں اداروں کی اہمیت اور بتدریج ترقی کے اسباب کو سمجھنے کے لیے تم کو ان اداروں کا ان کے آغاز سے خاتمہ تک جامع اور تقابلی مطالعہ کرنے پڑے گا اور اس طرح ان کے ارتقاء کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی ورنہ تمہیں سنگین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا'' عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بعد کے مؤرخین نے اس طریقہ کو اختیار کیا کہ سیاسی ارتقا کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے شاہی اصولوں کو بڑی سختی سے اختیار کیا لیکن جب اداراجاتی تاریخ لکھنے کی بات آئی تو بہت مناسب رویہ اپنایا گیا۔

6.5 چینی تاریخ نویسی کی روایت کی خصوصیات — Distinctive Features of Traditional Chinese Historiography

جیسا کہ ہم نے دیکھا چینی تاریخ نویسی کی روایت ان دونوں عناصر پر مشتمل ہے جو تاریخ نویسی کی دیگر عظیم روایتوں میں مشترک ہیں، لیکن چند خصوصیات ایسی ہیں جو بالکل منفرد ہیں جو مکمل طور پر چینی تمدن کی امتیازی خصوصیات سے متعلق ہیں۔ ذیل میں ہم اس روایت کی اہم خصوصیات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

6.5.1 سرکاری تاریخ — Official History

چینی تاریخ نویسی نمایاں طور پر سرکاری تاریخ نویسی ہے۔ اس کے کئی مفہوم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کام کو اکثر و بیشتر سرکاری عہدیداروں نے ہی انجام دیا۔ دوسرے یہ کہ بالخصوص ابتدائی زمانے کے بعد عام طور پر حکمرانوں نے اس کام کی نگرانی کی یا اسے تعاون دیا۔ حالانکہ چند مستثنیات بھی ہیں لیکن نجی تاریخ(Sishi) جو کہ یقینی طور پر موجود تھی اور بلاشبہ اسے احترام بھی حاصل تھا لیکن سرکاری طور پر تحریر کردہ تاریخ کے غلبہ کو اس نے کبھی چیلنج نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ تاریخی تحریر کے مشمولات اکثر انتظامیہ کے مسائل کو ہی ظاہر کرتے ہیں اور بالکل محدود طور پر حکمراں خاندان اور شہنشاہ کے مسائل ان میں ملتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اہم ذرائع جن پر تاریخ نویسی کی بنیاد ہے وہ سرکاری دستاویزات ہیں جس تک ان مؤرخین کی رسائی نسبتاً آسان تھی کیونکہ یہ سرکاری عہدیدار تھے۔ دوسرے معاشروں میں مؤرخین کے لیے اہم ذرائع جیسے زمین کے دستاویزات، نجی معاہدے، مقدماتی، دستاویزات وغیرہ کو روایتی چینی مؤرخین نے شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے۔

6.5.2 رہنمایانا تاریخ — Normative History

تاریخ نویسی لازمی طور پر رہنمایانہ ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے قارئین کے لیے رہنما کا کام دیتی ہے۔ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ شاہی سلسلہ کا نمونہ کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ بعد کے حکمرانوں کے لیے ایک نظام ہے کہ ان کو کیسے حکومت کرنی چاہیے۔لیکن یہ صرف شہنشاہوں کے لیے ہی سبق آموز نہیں ہے، بلکہ فرض شناس سرکاری عہدیدار جنہیں محکموں میں کوئی نہ کوئی دشواری پیش آتی ہے، جیسے فسادکن غیرملکیوں سے کیسے نپٹا جائے، رہزنی، بغاوت پر کیسے قابو پایا جائے ایسی صورت میں یہی توقع کی جاتی تھی کہ وہ تاریخ سے رجوع کرے گا کہ اس کے پیش روؤں نے ایسے مسئلوں کو کیسے حل کیا تھا۔ یہ صرف اطلاعات نہیں ہیں کہ تاریخ کی کتابوں میں انہیں تلاش کرلیا جائے۔ان میں حکمرانوں اور سرکاری عہدیداروں کے اقوال وافعال کی شکل میں فرض شناسی، اخلاقی دیانتداری اور دانشمندی کے نمونے تھے جو عالموں اور سرکاری عہدیداروں کے لیے سبق آموز اور انہیں تحریک دیتے تھے۔ایک عقل مند افسر اپنے اعلیٰ افسر یا شہنشاہ کے سامنے اپنے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس کی نظیر پیش کرتا تھا۔

6.5.3 معیاری نمونہ — Standard Format

تاریخ کے اہم کاموں میں ایک غیرمعمولی اصولی نمونے (Consistent Format) کی پیروی کی گئی ہے۔ایک زمانے سے شاہی خاندان کی تاریخوں اور جامع تاریخوں (Comprehensive Histories) میں یکساں طور پر ایک ہی طرح کے باب اور ان کے ذیلی ابواب شامل رہے۔جن کی بدولت بعد کے مؤرخین اور محققین کے لیے ان میں موجود معلومات کی بھول بھلیوں کو سمجھنا آسان ہوگیا۔مثال کے طور پر آج کوئی محقق قدیم چین یا کسی ادارے کے کسی مخصوص عہد پر کام کرتا ہے تو ان امور کی بدولت اسے متعلقہ ابواب تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔

6.5.4 معروضیت اور دیانت داری — Objectivity and Integrity

عظیم مؤرخ سماچن (Sima Qian) کے عہد سے ہی حقائق کو حتی الامکان معروضیت کے ساتھ مروج کرنا ایک مؤرخ کا فریضہ تسلیم کیا جاتا ہے۔روایتی چینی تاریخ نویسی میں یہ ایک قول محال (Pradoxe) بھی ہے کہ سرکاری (Official) اور معیاری (Normative) تاریخ پر زور دینا تاریخ نویسی میں معروضیت کے قیام کے لیے معاون نہیں ہے۔پھر بھی چارلس گارڈنر (Charles Gardner) جیسے سرکاری محقق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ نویسی کے سبھی چینی تصورات میں مکمل معروضیت کا مفروضہ شامل ہے۔مؤرخ جو مواد منظر عام پر لاتا تھا اس میں مؤرخ کی انفرادی شخصیت اور آراء کی دخل اندازی کی گنجائش نہیں تھی۔اگر اس بات کو محسوس کیا گیا کہ یہاں مؤرخ نے اپنی طرح لکھنے کی کوشش کی ہے، عموماً وہاں خلاصے اور تبصروں (Comments) میں اتنے حصے کو بقیہ امور سے صاف طور پر علیٰحدہ کردیا گیا۔اس کے علاوہ اپنے تحقیقی ماخذ سے وفاداری اور دیانت داری کے باوصف اکثر مؤرخ اپنے الفاظ میں موضوع کو بیان کرنے یا اس کی وضاحت کرنے کے بجائے اس ماخذ سے لفظ بہ لفظ اقتباس اتار لیتے تھے۔اس امر کو ادبی سرقہ سمجھنے کے بجائے تاریخی تشکیل نو کا سب سے زیادہ فطری اور منطقی طریقہ سمجھا جاتا تھا۔اس طرز سے معیاری چینی تاریخ نویسی کتر بیونت (Cut and paste) چسپیدگی کی شکل میں تبدیل ہوگئی جو اکثر نئی تحقیق کے بجائے ماقبل کے کاموں کی ترتیب وتدوین کے مترادف لگتی ہے۔''کتر بیونت اور چسپیدگی'' طریقہ حالانکہ کبھی کبھی وسیع مطالعے اور تھکانے والا کام ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چینی تاریخ کے ابتدائی دور کی بہت سی تصنیفات جو خصوصاً زمانہ حال کا حصہ نہیں ہیں، آج بھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئیں کیونکہ ان تصنیفات کے صحیح صحیح اور لمبے لمبے اقتباس بعد کی تاریخی تصنیفات میں پوری طرح محفوظ ہیں۔

6.6 تلخیص — Summary

آخر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چین کے خسروی عہد کے خصوصاً عظیم ہان (Han) مؤرخین کے بعد کے مؤرخوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ تاریخ کی عظیم روایت کا ایک حصہ ہیں۔کبھی کبھی ان کے اختیارات (Experiment) کی آزادی سلب ہوجاتی تھی کیوں کہ وہ اپنے عظیم پیش روؤں کے بنائے ہوئے

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * Hyderabad-32
IMC LIBRARY

نمونوں کے پابند تھے۔لیکن دوسرے معنی میں انہوں نے ماضی کے اہم دستاویزوں کو جس طرح محفوظ کیا ہے ان کی استقامت، تسلسل اور عام اعتبار دوسری تہذیبوں اور سماجوں سے بالاتر ہے۔چینی یا بیرونی نژاد سبھی بڑے یا چھوٹے شاہی خاندان اخلاقی طور پر روایت کو قائم رکھنے اور تاریخ نویسی کی روایت کے تسلسل کو جاری وساری رکھنے کے لیے پابند تھے۔اس احساس وشعور نے کہ وہ ایک عظیم روایت کا حصہ ہیں، چین کے مؤرخوں اور ان کے کاموں کو سرفراز کیا۔اور تاریخ اور کلاسیکی روایت کی غیر معمولی اہمیت کو احترام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

6.7 اہم شاہی خانوادوں کی زمانی ترتیب — Chronology of major Dynasties

شانگ	1715-1122ق م
جھو	1122-221 ق م
مغربی جھو	1122-771 ق م
مشرقی جھو	770-256 ق م
دور بہار وخزاں	772-256 ق م
نبرد آزما ریاستوں کا عہد	403-221 ق م
چن	221-203 ق م (چین کا پہلا اتحاد)
ہان	220ء-202 ق م
ہان اول	203--9 ق م
ہان ثانی	23-220ء
دور عدم اتحاد	220-589ء
سوئی	589-618ء
تانگ	618-906ء
پانچ شاہی خانوادے	907-960ء
سونگ	960-1279ء
سونگ اول	960-1126ء
سونگ ثانی	1127-1179ء
یوآن منگول	1260-1368ء
منگ	1368-1644ء
چنگ (منچو)	1644-1911ء

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD Accn. No. MA-... Date 03.08.2013

6.8 مشقیں — Exercises

1- کنفیوشس ازم نے قدیم چین کی تاریخ نویسی کو کس طرح متاثر کیا؟

2- ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کے ارتقاء سے بحث کیجیے؟

3- ماقبل جدید عہد میں تاریخ نویسی سے متعلق نظریات پر روشنی ڈالیے؟

4- چین کی روایتی تاریخ نویسی کی خصوصیات بیان کیجیے؟

6.10 مجوزہ کتابیں — Suggested Readings

William Theodore de Bary (Comp.), Sources of Chinese Tradition, Vol.1 (New York and London, Columbia University Press, 1960)

Charles S. Gardner, Chinese Traditional Historiography (Cambridge, Massachusetts, Harvard University Press, 1961)

John King Fairbank and Edwin Reischauer, East Asia: The Great Tradition (Boston, Houghton Mifflin Company, 1958, 1960)

Etienne Balasz, Chinese Civilization and Bureaucracy (New Haven, Yale University Press, 1964)

Endymion Wilkinson, Chinese History: A Manual (Cambridge, Massachusetts and London, Harvard University Press, 2000)

J, Meskill (ed.) The Pattern of Chinese History: Cycles, Development, or Stagnation? (Boston, Heath, 1965)

یونٹ نمبر 7

Historiographical Traditions in Early India — قدیم ہندوستان میں تاریخ نویسی کی روایت

Structure — ساخت

Introduction	تعارف	7.1
Earliest 'Histories': The Vedic Danastutis	قدیم ترین تواریخ: ویدک دانستونیا	7.2
Are The Epics Historical Narratives?	کیا رزمیے تاریخی بیانیے ہیں؟	7.3
Puranic Genealogies And What They Tell Us	پورانوں کے نسب نامے اوران کی بیان کردہ تفصیل	7.4
Courtly Traditions: Prasastis	درباری روایات: پرشتیاں	7.5
Courtly Traditions: Charitas	درباری روایات: چرت	7.6
A Poet/Historian: Kalhana and The Rajtarangini	شاعر/مؤرخ: کلہن اورراج ترنگنی	7.7
Other Traditions Of Historical Writing	تاریخ نویسی کی دیگر روایات	7.8
Dating Systems	نظام تعین زمانہ	7.9
Summary	خلاصہ	7.10
Exercises	مشقیں	7.11
Suggested Readings	مجوزہ کتابیں	7.12

Introduction — 6.1 تعارف

یہ بات بڑی فرسودہ لگتی ہے کہ تاریخ ماضی کا مطالعہ ہے، لیکن تاریخ نویسی کی قدیم روایات کو سمجھنے کے لیے اس بات کو مدنظر رکھنا شاید مفید ہوگا کہ تاریخ کی تعریفات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں۔

آج ہمارے ذہن میں تاریخ کی تفہیم کے لیے کافی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔آج ہم تاریخ کو شہنشاہوں کے وقائع (Chronicle) کے مترادف نہیں سمجھتے بلکہ آج تاریخ نویسی ماحول (Environment) کی تواریخ کی تلاش وجستجو اوراس کی تشکیل نو کی کوشش میں صنفی (Gender) رشتوں، سماجی انواع اوران طبقات کی تاریخ میں دلچسپی لیتے ہیں جو حاشیے پر تھے، محکوم تھے، یہاں تک کہ بے معنی تھے۔وہ ان عملوں (Processes) اورعلاقوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں جن کے دائرے میں یہ تھے۔ ان میں سے بہت سی چیزوں کو قدیم تاریخ میں یا تو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے یا بہت ہی کم جگہ دی گئی۔تو پھران کاموں کا مرکزی نقطہ کیا تھا؟

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر تصانیف حکمراں اشرافیہ کے استعمال کے لیے اکثر تعلیم یافتہ لوگوں جیسے برہمنوں نے لکھی ہیں جو نئے آرزومند امیدواروں کے دعووں کو جائز ٹھہرانے اورانہیں ثابت کرنے کی غرض سے تحریر کی گئی تھیں۔ان کاموں کا مقصد قائم شدہ حکمرانوں کے دعووں کو مستحکم بھی کرنا تھا۔اس طرح مصنفوں اوران کے سرپرستوں کی فکروتشویش انتہائی محدود دکھائی دیتی ہے۔ان بیانیوں میں عام مردوں اورعورتوں سمیت ایک بڑی آبادی کا بیان یا تو بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔

ان کاموں کو ان کی محدودیت کی وجہ سے رد کردینا آسان اور شاید حسب حال بھی لگتا ہے۔ پھر بھی یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ ان کی اہمیت و

افادیت پر تقریباً دو صدیوں سے بحث و گفتگو ہوتی رہی ہے اور ان روایات کی تنقید و تحسین جن کے دائرے میں یہ تصنیفات وجود میں آئیں، ہماری ماضی فہمی میں بیش قیمتی اضافہ کرسکتی ہے۔

ابتداء میں استعماری سیاق میں جدید تجزیاتی طریقہ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے ان متون کی جانچ پڑتال کی گئی۔ ان کاموں کو جن کا مقصد اتہاس (لفظی معنی جیسا وہ تھا) اور پران (قدیم) تھا، ان کا تقابل روم اور یونان میں لکھی گئی تاریخوں سے کیا گیا اور انہیں نامکمل پایا گیا۔ خصوصاً یہ بیانیے مکانی (Spatial) اور سلسلۂ زمانی (Chronological) کے اعتبار سے نامکمل تھے جنہیں کسی بھی تاریخ کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ بات واضح اور غیر واضح طور پر موضوع بحث رہی کہ قدیم ہندوستان اور ان کے بعد کی نسل اپنے ہم عصر مغربی مصنّفین سے علم و دانش کے لحاظ سے کم تر تھی۔ ظاہر ہے کہ تاریخ اور ماضی کے واقعات سیاسی طاقت کے تصور سے بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

جیسا کہ امکان تھا کہ ایسی کوششوں کا ردِعمل ہوا جو یہ باور کرا رہی تھیں کہ ہندوستانی لوگ تاریخ نویسی کے اہل نہیں تھے۔ جس کے نتیجے میں ایسے سبھی متنی روایات کو جامع تاریخی حقائق کہہ کر ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا جن میں ذرا بھی زمانی ترتیب دکھائی دی۔

اس ردِعمل کا بھی تنقیدی تجزیہ کیا گیا اور ان پر سوال اٹھائے گئے۔ تاریخی اہمیت کے حامل قدیم متون اور روایات کی مخصوص مثالوں کا تجزیہ کرتے وقت اس سیاق اور تناظر کو دھیان میں رکھنا مفید ہوگا۔

7.1 قدیم ترین تواریخ: ویدک دانستوتیاں Earliest 'Histories': The Vedic Danastutis

اگر ہم تواریخ کو ان مندرجہ واقعات (Recording Events) کے طور پر سمجھیں جو زمانی ترتیب کے مطابق مصنّفین کے لیے اہم تھے تو ان میں سے کچھ اولین مثالیں رگ وید کی ہیں (2200 ق م)۔ اس میں اشلوک ہیں جنہیں دانستوتی کہا گیا ہے۔ (دان کی تعریف میں) یہ استوتیاں دان لینے والوں نے لکھی تھیں جو پجاری تھے اور ان میں اکثر داتا کے نام کو بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نمونہ دیکھیے۔ یہ اشلوک رگ وید یا آٹھویں منڈل کی دوسری تحسینی نظم سے لیے گئے ہیں:

یدُ کا لڑکا جو مویشیوں سے متمول ہے، بیش قیمتی چیزوں کو دان کرنے میں ماہر ہے۔

اسنگ کے لڑکے سوندرتھ کو ہر طرح کا سکھ اور چین حاصل ہو۔

پلایوگ کے لڑکے اسنگ نے سب سے بڑھ کر دس ہزار گائیں دان کیں۔

میرے پاس ان کے دس بیل ہیں۔

جیسا کہ اس مثال سے واضح ہے کہ دان لینے والا اظہارِ تشکر کرتا ہے اور داتا کی خیر و عافیت کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس طرح کا اظہارِ تشکر یا اعلان بڑی مذہبی رسوم جیسے اشومیگھ وغیرہ میں ہوا کرتا تھا۔ مذہبی رواج کے مطابق قربانی کے گھوڑے کو ایک سال کی مدت کے لیے گھومنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس دوران ایک برہمن پجاری ہر صبح سرپرست کی سخاوت کے قصیدے پڑھا کرتا تھا اور ہر شام ایک کشتریہ اس کی بہادری کے کارناموں کی مدح سرائی کرتا تھا۔ اس بات کے قوی امکان ہیں کہ بہت سی کتھائیں جو بعد میں پرانوں اور رزمیوں میں شامل کی گئیں اسی طرح کے بیانیوں سے تشکیل ہوئی ہوں۔

اس بات پر غور کیا جانا چاہیے کہ کیا درج کیا جائے اور کیوں۔؟ ان مدح سرائیوں میں برہمنوں یا کشتریوں کے نقطۂ نظر سے جو کچھ بھی مثبت یا حسبِ منشا سمجھا گیا اسی کو بیان کیا گیا دوسری سرگرمیوں یا ناکامیوں سے صرفِ نظر کیا گیا یہاں تک کہ انہیں حافظے سے بھی محو کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ داتا کی سخاوت اور بہادری کا بیان عمومی اور معروضی بیان نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد راجاؤں کی امید پر کھرا اترنا تھا۔ اس طرح یہ تواریخ سرپرستوں کے سیاق سے ملحق ہیں۔

7.3 کیا رزمیے تاریخی بیانیے ہیں؟ Are The Epics Historical Narratives?

روایتی طور پر مہابھارت کو تاریخ اور رامائن کو رزمیہ مانا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی پیچیدہ اور لمبی تاریخ ہے۔ رزمیوں میں شامل کتھاؤں کا مغز پہلی بیسویں

صدی ق م کی ابتدائی صدیوں میں مل سکتا ہے لیکن تحریری متن کے طور پر یہ کافی بعد میں (چوتھی پانچویں صدی عیسوی) میں وجود میں آئیں۔ کئی صدیوں سے ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ بعد کے ویدک ادب میں کوروں اور پانچالوں کا ذکر عام طور سے کیا گیا ہے (پہلی بیسویں صدی ق م کا نصف)۔ رزمیوں میں موجود مخصوص کرداروں کے سیاق ویدک ادب میں مقابلتاً ناکافی ہیں جب کہ یہ دونوں خاندان مہابھارت میں بہت اہم تھے۔ رامائن کے کوسل اور ویدیہہ جیسے جائے وقوع اور بھی کم ہیں یہاں تک کہ رزمیوں کے اہم کردار بعد کے ویدک ادب میں شاذونادر ہی ملتے ہیں۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے یہ اشارے برآمد ہوتے ہیں کہ مہابھارت سے متعلق مقامات ہستیناپور اور اندر پرستھ اور رامائن سے متعلق مقام ایودھیا اس عہد میں ماقبل شہری (Pre-Urban) چھوٹی بستیاں تھیں۔

رزمیوں میں شامل واقعات کو تاریخی طور پر ثابت کرنا ممکن ہے۔ پھر بھی متون کا اسلوب کے سیاق میں تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے۔ مہابھارت میں مہتابی سلسلۂ نسب (Lunar Lineage) اور رامائن میں آفتابی سلسلۂ نسب (Solar Lineage) کا بیان ہے۔ ابتدائی عہد وسطیٰ (ساتویں صدی عیسوی) میں کچھ راجاؤں کا سلسلۂ نسب انہی خاندانوں سے ملتا ہے۔ یہ سلسلۂ نسب غیر حقیقی بھی ہوسکتا ہے لیکن سماجی سیاسی سرگرمیوں کو اجاگر کرنے کی وجہ سے یہ اہمیت کا حامل ہے۔

7.4 پورانوں کے نسب نامے اور ان کی بیان کردہ تفصیلات

Puranic Genealogies And What They Tell Us

پہلی بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک ایک قسم کا ادب پران نام لکھا گیا۔ رزمیوں کی طرح پرانوں کے پیش رو بھی قدیم ترین ہیں۔ مہابھارت کی مثال میں سوت کہلانے والے ایک سماجی طبقے نے پرانوں میں شامل کچھ بیانیوں کی تخلیق، ترتیب اور ان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اکثر سوت لوگوں کو بھاٹ (Bards) مانا جاتا ہے۔ قدیم ریاستوں میں وہ اتنی اہمیت کے حامل تھے کہ انہیں بعد کے ویدک ادب کے متون میں راجا کے مخصوص معاونین یا ''جواہر'' کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ وہ راجا کے ہرکاروں کے طور پر کام کرتے تھے، جنگوں میں اس کے ساتھ رہتے تھے، اور راجا کے عظیم کارناموں کو محفوظ رکھتے تھے اور انہیں لوگوں کو سناتے تھے۔ تاہم دھرم شاستروں جیسے منواسمرتیوں میں انہیں کم تر درجے کے لوگوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں کچھ لوگ شاید برہمن راجا کا قرب حاصل کرنے اور سرکاری گاتھاؤں کو محفوظ کرنے کے لیے سوتوں کے دعووں کو رد کیا کرتے تھے جب رزمیے اور پران تحریری شکل میں آگئے تو سوتوں کے بجائے برہمنوں کو ان کا تخلیق کار تسلیم کیا گیا۔

پرانوں میں ہمیں دو یا تین قسم کے سلسلۂ نسب کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی قسم سنتوں کے سلسلۂ نسب کی ہے۔ یہ سلسلۂ نسب شاید علم منطق ترویج و اشاعت کا ضامن تھا جس کا ذکر کچھ اپنشدوں اور دھرشاستروں میں بھی ملتا ہے۔ دیگر سلسلۂ نسب حکمرانوں کا ہے۔ جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کلی یگ کے آغاز سے پہلے کے لوگوں کا اور دوسرے حصے میں کلی یگ کے بعد کے راجاؤں کا ذکر ہے۔

آفتابی اور مہتابی سلسلۂ نسب کو بیان کرنے والے پہلے حصے میں رزمیوں کے ہیرو بھی شامل ہیں۔ دراصل مہابھارت کی اہم اور نتیجہ خیز جنگ کو انسانی تاریخ میں ایک اہم موڑ (برائی کا) اور تنزل کے دور کی ابتدا یعنی کلی یگ کے آغاز کا اشارہ یہ مانا گیا ہے۔ سلسلۂ نسب کی دوسری قسم نسبتاً لافانی راجاؤں کی ہے ان کی یہ خصوصیت دلچسپ ہے۔ ان سبھی سلسلۂ نسب جو کچھ مثالوں میں تقریباً پانچویں صدی تک چلے، کا بیان زمانۂ مستقبل میں ہے۔ مثال کے طور پر چوتھی صدی قبل مسیح سے شمالی ہندوستان پر حکومت کرنے والے گپت حکمرانوں سے متعلق ایک شلوک اس طرح ہے:

''گپت خاندان میں پیدا ہونے والے راجا ان بھی علاقوں پر حکومت کریں گے جیسے گنگا کے کنارے بسے پریاگ (الہ آباد)، ساکیت (مشرقی یوپی) اور مگدھ''۔

یہ سلسلۂ نسب کیوں ترتیب دیا گیا اور ان کی تشکیل کیوں اتنی غیر معمولی ہے؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس ترتیب کی آخری شکل گپت حکمرانوں کے دور میں وجود میں آئی ہو کیونکہ کچھ مستثنیات کے علاوہ بعد کے حکمرانوں کا اس میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ کیا زمانۂ مستقبل کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ ان حکمرانوں کا حکومت کرنا اٹل تقدیر تھا، تو کیا جواز پیدا کرنے کے لیے یہ ایک ممکنہ حکمت عملی تھی؟ یہ ممکن ہے کہ اس بات سے استقامت کا وہم پیدا ہوا ہو جو ایک غیر مستحکم سیاسی صورت حال میں زیادہ اہم ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پرانوں کے سلسلۂ نسب میں مذکورہ کئی راجاؤں کے بارے میں سکوں اور کتبوں جیسے دیگر ذرائع سے

بھی علم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ کچھ راجا جن کا حوالہ دیگر ذرائع میں بھی ملتا ہے، ان سلسلۂ نسب میں بھی شامل ہیں۔ حکمرانوں کے نام اور ان کے عہد حکومت کے عرصہ کو بیان کرنے کی روایت عام طور سے جاری تھی اور پرانوں کی روایت میں کس حد تک منظم تھی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ کچھ تاریخی موقعوں پر جب حکومت کے لیے یا اسے استحکام بخشنے کی کوشش کی جاتی تھی تو ایسی صورت میں سلسلۂ نسب خاص طور پر اہم ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں بھی سلسلۂ نسب اہم ہو جاتے تھے جب یہ دعوے کھوکھلے ہوں۔ سلسلۂ نسبوں کے اظہار میں پوشیدہ تسلسل کے دعوے خاص طور سے اس وقت اہم ہو جاتے ہیں جب وہ جمع شدہ سرمائے کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوں۔ اس سرمائے میں زمین اور آخری تجزیہ میں حکومت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی اہم ہے کہ ان سلسلۂ نسب میں بے دخلی اور شمولیت کے اصولوں پر دھیان دیا جائے۔ ہم اس بات کا تجزیہ کر سکتے ہیں کہ نسلی قرابت (Kinship) دورخی (یعنی والدین سے) وہ یا تو پدرانہ ہے یا بہت کم مثالوں میں مادرانہ۔ ہم ان متون میں چھوٹے اور بڑے بھائیوں کے لیے متعینہ مرتبوں کی بھی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔ اس طرح سلسلۂ نسب اکثر نسلی قرابت کے بارے معلومات بہم پہنچاتے ہیں جس کا تعین قدر ہو چکا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ یہ سلسلۂ نسب درحقیقت صحیح نہیں ہیں پھر بھی جہاں تک یہ ماضی کے چنندہ واقعات اور پیش رووں پر روشنی ڈالتے ہیں، یہ ہمیں ان حالات کا اندازہ لگانے کا موقع دیتے ہیں جن میں ایک اساطیری ماضی کا تصور کرنے یا اس کو پیدا کرنے کی حکمت عملیاں ضروری رہی ہوں گی۔

7.5 درباری روایات: پرشتیاں — Courtly Traditions: Prasastis

ابھی تک ہم جس ادب پر غور وفکر کر رہے ہیں اس میں زیادہ تر ادب نسبتاً آسان سنسکرت میں منظوم ہے۔ سنسکرت کی محدود رسائی کے باوجود پرانوں اور رزمیوں میں اس بات کا التزام رہا ہے کہ یہ عورتوں اور شودروں سمیت عام لوگوں کو سنائے جا سکتے ہیں اور ممکن ہے سنائے بھی جاتے ہوں جن کی رسائی سنسکرت تک نہیں تھی۔ دوسرے الفاظ میں ایسی کئی ''تاریخیں'' تھیں جو سماج کے تمام طبقوں کو دستیاب تھیں۔ ان کا مقصد صرف ماضی کے بارے میں فہم پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ انہیں معاشرتی معیارات کی معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایک زاویہ سے یہ دونوں مقاصد متوازی تھے۔

اسی زمانے میں متون کی دیگر قسمیں بھی تھیں جو شاید زیادہ محدود اور اشرافیہ طبقے کے لیے تھے، یہ متن شاہی دربار سے متعلق تھے اور انہیں مؤثر بنانے کے لیے اکثر دوسری ترکیبوں کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور استعاروں کے خاطر خواہ استعمال سے مرصع سنسکرت میں لکھا گیا ہے۔ ان متون کی مثالیں پرشتیوں یا مدحیہ کتبوں اور چرتروں میں بھی ملتی ہیں۔ پرشتیوں کی کچھ ابتدائی مثالیں پراکرت میں ہیں لیکن سب سے اچھی مثالیں سنسکرت میں ہیں۔ ایسے کتبے چوتھی صدی عیسوی سے برآمد ہونے شروع ہوئے۔ یہ کتبے اکثر آزادانہ طور پر لکھے گئے تھے لیکن یہ منتی کتبے (Votive Inscriptions) کا حصہ بھی ہو سکتے ہیں، جس میں سخی حکمراں کی سخاوت کو بیان کیا گیا ہو۔

ان پرشتیوں میں شاید سب سے زیادہ مشہور سمدر گپت کی پریاگ پرشتی ہے جسے الہ آباد کا ستون کتبہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پرشتی ایک اشوک ستون پر کندہ ہے۔ اس کی تخلیق ہری سین نے کی تھی جو کئی عہدوں پر فائز ہونے کے علاوہ ایک استاد شاعر تھا۔ بادشاہ پر کیسے اس کے والد کی نظر انتخاب پڑی، اس کے عظیم کارنامے، وہ حکمت عملیاں جن سے اس نے دوسرے ملکوں کے راجاؤں کے دل جیتے، اس کی بلند پایہ خصوصیات اور لامحدود علمیت کا ذکر اس کتبے میں کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ بادشاہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جو کسی بھی چیز کے لیے ہمہ جہتی اہلیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ بادشاہ کے ان عظیم کارناموں میں کچھ صداقت ہو۔ پھر بھی ان میں شاعرانہ مبالغہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ آیئے اس بات کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ بادشاہ کے جسم پر روشنی ڈالتے ہو کہا گیا ہے کہ کلہاڑوں، تیروں، بھالوں، کیلوں، تلواروں، گداؤں، نیزوں اور دوسرے اسلحوں کے وار سے پیدا ہونے والے زخموں سے مزین ہو کر اس کا جسم اور بھی دلکش ہو گیا ہے۔ مرصع سنسکرت میں اس طرح کا تفصیلی بیان حکمراں طبقے کو متاثر کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔

ایک دیگر پرشتی ساتویں صدی عیسوی کے چالکیہ بادشاہ پلکشین دوم کی ہے۔ اس پرشتی کی تخلیق کرنے والے کوی روی کیرتی نے اپنے فن کا تقابل کالیداس اور بھیروی سے کیا ہے۔ اس میں اس کی فوجی کارگزاریوں کی تفصیل ملتی ہے جس میں شمالی ہند کے راجا کو شکست دینا بھی شامل ہے۔ روی کیرتی کی تخلیق اس کتبے کا حصہ ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوی نے کیسے ایک جین رہنما کو ایک گھر دان میں دے دیا۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE * MANUU * IMC LIBRARY * Hyderabad-34

7.6 درباری روایات: چرت Courtly Tradtions: Charitas

درباری روایات سے متعلق ایک دوسری قسم چرت ہے۔ چرت عظیم لوگوں کی حیات اور کارناموں کا بیان تھے۔ اکثر چرت سنسکرت میں ہیں اور پرشتیوں کی طرح یہ فن پارے بھی مرصع اسلوب کے حامل ہیں۔ ان متنوں کی طوالت دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ان کی تخلیق پوری طرح اشرافیہ کے لیے کی گئی تھی۔ چرت کی بات یہ ہے کہ ابتدائی چرتوں میں ایک بدھ چرت بھی ہے جو اشوگھوش (پہلی صدی ق م) کی تخلیق ہے۔ سنیاسی زندگی کی تصویرکشی کا دعویٰ کرنے والے کوی نے تفصیل کے ساتھ درباروں کی تعیش پسندی اور عورتوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس فن پارے میں کشان کے دربار کی تصویرکشی کی گئی ہو۔ چرتوں میں شاید سب سے زیادہ معروف چرت ہرش چرت ہے جس کے مصنف بان بھٹ ہیں۔ یہ ہرش کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانے کی تفصیل فراہم کرتی ہے۔ بان بھٹ کی تصنیف سنسکرت ادب میں کچھ پیچیدہ نثر کا نمونہ ہے جو فن کارانہ انداز سے ممدوح راجا کی خصوصیات بیان کرتی ہے۔ ہرش کے پاؤں کے بیان میں مندرجہ ذیل عبارت اس اسلوب کی ایک مثال ہے:

''اس کے پاؤں لال جیسے باغی راجاؤں پر قہر سے ہوئے ہوں اور وہ شکست خوردہ سلطانوں کے طروں پر لعل جواہر کی سی تیز لال، روشنی ڈال رہے تھے اور سبھی بہادر اور قوی لوگوں کے سورج کو مندمل کر رہے تھے۔''

چرتوں کے تخلیق کاروں نے دوسری مہارتوں کا ثبوت بھی دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پال حکمراں رام پال (12-11ویں صدی عیسوی) کی مدح سرائی کرنے والے کوی سندھیا کرنندن نے رام چرتر کی تخلیق اس طرح کی کہ اس کے ہر ایک پہلو کی تفصیل یا تو رزمیہ کے ہیرو کی زندگی یا پھر اس کے سرپرست کے طور پر کی جا سکتی تھی۔ اس بات کا امکان ہے کہ پرشتی اور چرت دونوں ہی ان حالات میں خاص طور پر بیش قیمتی تھے جن میں حکمراں کچھ غیر محفوظ تھے۔ جن چار حکمرانوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ بات واضح ہے کہ تخت سلطانی کے لیے ان کے دعوے خلف اکبر ہونے کے ناطے نہیں تھے۔ سمدرگپت کے بارے میں ہری سین لکھتا ہے کہ ان کے والد نے مخالفین کے دعووں کو نظرانداز کرتے ہوئے انہیں منتخب کیا۔ پلکیشن اپنے پیش رو راجا کا بھتیجا تھا۔ ہرش اپنے بڑے بھائی کی ناگہانی موت کے بعد گدی پر بیٹھا۔ تخت شاہی کے لیے اس کا کوئی سیدھا دعویٰ نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ مفصل متون کسی حد تک ان راجاؤں کو عظیم بنانے کے لیے اپنائی گئی تدبیروں کا نتیجہ ہوں جو بصورت دیگر کمزور تھے۔

7.7 شاعر/مؤرخ: کلہن اور راج ترنگنی A Poet/Historian: Kalhana And The Rajtarangini

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں لکھی گئی ایک واحد تاریخی تصنیف راج ترنگنی یعنی راجاؤں کی ندی تھی جس کے مصنف کلہن تھے (12ویں صدی عیسوی)۔ ایک سطح پر راج ترنگنی میں کشمیر کے ابتدائی عہد سمندر سے زمین کی تخلیق کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ آٹھ کتابیں یا ترنگے ہیں جو منظوم ہیں۔ پہلی تین ترنگوں میں کشمیر کی ساتویں صدی عیسوی تک کی تاریخ ہے۔ چوتھی سے چھٹی ترنگ میں اس سے آگے 11ویں صدی عیسوی تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور آخری دو ترنگوں میں (جو سب سے زیادہ طویل ہیں) 12ویں صدی عیسوی کا بیان ہے۔ دلچسپ بات یہ دیکھنا ہے کہ ان بیانیوں کا اسلوب کیسے بدلتا ہے: پہلے حصے میں تخلیق کار جو کہ برہمن وزیرزادہ ہے اور سنسکرت کا عالم ہے، ایک تصویر بناتا ہے جو کہ اس کے مطابق ایک مثالی عالم ہے جس میں بیٹے اپنے باپ کے وارث ہوتے تھے اور جس میں نسلوں اور صنفی تفریق کی روایت کا سختی کے ساتھ اتباع کیا جاتا تھا حالانکہ اگلے دو حصوں میں وہ تفصیل سے ذکر کرتا ہے کہ ان اصولوں سے روگردانی کیسے کی گئی۔ کلہن کے مطابق عورتوں کا راجا ہونا کس قدر خوفناک تھا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور کا قاری اس متن سے بھلے ہی کچھ مواد اخذ کرے لیکن وہ کلہن کے نظریے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔

کلہن کی تصنیف کو جو بات بے مثال بناتی ہے وہ ہے ماخذ کی نشاندہی جن کی مدد سے اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ان میں مذہبی تصدیقات سے متعلق سرکاری یا شاہی بیانات و اعلانات، پرشتیاں یا مدح سرائی اور شاستر شامل ہیں۔

مذہبی اداروں اور امداد شاہی کتبوں اور تحریری دستاویزوں سے متعلق پیش رو راجاؤں کے احکامات کی جانچ پڑتال سے سبھی پریشان کن غلطیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ وہ التباس صداقت اور تخیلی عمل کے مابین فرق اور امتیاز قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تبدیلی قسمت کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ زیادہ تر ایجابی تقدیر پر منحصر ہے

REFERENCE ONLY

جومصنف کے مطابق پراسرار ہے۔

ابتدائی تخلیق کاروں پر کلہن کی تنقید کافی سخت ہے کیوں کہ اس کے مطابق ان کے فن پاروں میں غلطیوں کے انبار ہیں اور اسلوب کی کمی ہے۔ بدقسمتی سے اس کے پیش رووں کی کوئی بھی تحریر آج محفوظ نہیں اس لیے کلہن کے دعووں کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس نے خود ایک مثال قائم کی جس کو بعد کے مصنفین نے ایک نمونے کے طور پر قبول کیا اور اس کے بیانیے کو کشمیر کے سلطانوں کے عہد تک جاری رکھا۔

کلہن خود کو ایک کوی مانتا تھا۔ اس کے مطابق ایک کوی کو روشن بصیرت کا حامل اور ہندو مسلمات کے مطابق کائنات کی تخلیق کرنے والے پرجاپتی کی طرح قدرت کا حامل ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی تحریروں کو درسی متن کی طرح پیش کیا جو خاص طور پر راجاؤں کو درس دینے کے لیے تھا۔ ان میں غیر جانب دارانہ فیصلے اور ذات سے ماورا ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کوی کی حیثیت سے کلہن نے سنسکرت زبان کی روایت کی پاسداری کی جس کے مطابق فن پارے میں ایک مساوی رس ہونا چاہیے۔ اس نے جس رس کو اہمیت دی وہ شانت رس تھا۔ حالانکہ ایسے حصے بھی ہیں جن میں جنگ کی پرتشدد ہیبت ناکی اور اس کے بعد کی تباہی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلہن واضح طور پر دربار سے قریب تھا لیکن وہ درباری کوی نہیں تھا۔

7.8 تاریخ نویسی کی دیگر روایات — Othe Traditions Of Historical Writing

جب تاریخ نویسی کی اکثر روایات راجاؤں سے متعلق تھیں اس وقت مذہبی اداروں کے اثر سے دیگر روایات کا نشو ونما ہوا۔ ان میں بدھ، جین اور ہندو ادارے شامل تھے۔ ان میں سے قدیم ترین بودھ روایت آج شاید سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بودھ روایت میں تین بودھ کاؤنسلوں کا ذکر ہے جن میں قدیم ترین بودھک اصولوں اور ان کی تعلیمات کا بیان ہے۔ رفتہ رفتہ جب مٹھوں کا نظام مستحکم ہوا تو زیادہ منظم تفصیلات پیش کی گئیں اور نظام تعین زمانہ یعنی سالوں کو بدھ کی وفات یا مہاپری نروان کے طور پر نشان زد کرنے کا طریقہ استعمال کیا گیا۔ یہ تفصیلات اس لیے زیادہ ضروری ہوگئیں تھیں کیوں کہ اس وقت مٹھ متمول اداروں کے طور پر قائم ہو چکے تھے۔ مٹھوں کو گانو، زمین اور دیگر ساز وسامان اور نقد سرمایہ بھی سرپرستوں اور راجاؤں سے حاصل ہوتا تھا۔ اس طرح کی تاریخ سری لنکا میں سب سے بہتر طور پر محفوظ رکھی گئی جہاں حکومت اور مٹھوں کے مابین قرابت زیادہ تھی۔ ان تعلقات کو دیپ ونش اور مہاونش متون میں خاطر خواہ طور پر بیان کیا گیا ہے۔

7.9 نظام تعین زمانہ — Dating Systems

تاریخ میں مسلم سنین سے واقفیت ضروری ہے اس لیے اس سیاق میں قدیم ہندوستان میں استعمال ہونے والے مختلف تعین زمانہ کے طریقہ کاروں کی جانچ پڑتال اہم ہو جاتی ہے۔ کئی صدیوں تک مستعمل اور قدیم ترین طریقہ کاروں میں ایک طریقہ وہ تھا جس میں سنہ جلوس (Regnal Years) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کے تحت راجا اپنی حکومت شروع کرنے کے سال کو پہلا سال مانتے ہوئے اپنے دور حکومت کے زمانے کا حساب رکھتے تھے۔ یہی طریقہ کار موریہ بادشاہ اشوک نے اپنایا تھا۔ اشوک نے اپنے ابھشیک (مقدس آب سے غسل) کی تاریخ کو حکومت کے آغاز کا وقت قرار دیا۔ ہمیں اس کی تیرہویں سرکاری احکامات کے کتبے سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس نے کلنگ پر حملہ کیا۔

اس کے علاوہ شاہی خانوادوں پر منحصر ادوار کا نشو ونما ہوا۔ اس طریقہ کار کی معلوم مثال گپت عہد سے ملتی ہے۔ اس کا آغاز 320 عیسوی سے مانا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جو پہلے اہم ترین گپت راجا چندر گپت اول سے منسوب کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عہد کا آغاز چندر گپت دوم کے عہد سے راجع بہ ماضی کے اثر سے ہوا یعنی جس دن سے اسے شروع ہونا تھا اس کے 80 سال بعد اس کی گنتی شروع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گپت راجاؤں نے پکڑ مضبوط کرنے کے بعد ہی زمانی تعین شروع کیا اور تخت شاہی پر اپنے دعوے کو ماضی میں اتنے دور تک لے گئے جہاں تک ممکن تھا۔

وکرم سنوت (58 صدی ق م) اور شک سنوت (78 صدی عیسوی) اسی طرح کے دوسرے زمانے ہیں جو تقریباً دو ہزار سال تک چلتے رہے۔ یہ دونوں سنوت بھی شاید سنہ جلوس سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کا تعلق کن راجاؤں سے ہے اس پر عدم اتفاق ہے۔ وکرم سنوت خاص طور پر اس نظریے کی زائدہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں کئی

راجاؤں نے وکرمادتیہ (لغوی معنی آفتاب شجاعت) کا لقب اختیار کیا اور ہمارے پاس یہ طے کرنے کا کوئی ذریعے نہیں ہے کہ ان میں سے کس نے آج کے زمانے میں مستعمل سنوت کی ابتدا کی۔ شک سنوت کا آغاز منطقی طور پر سب سے زیادہ مشہور کشاں بادشاہ کنشک کے عہد حکومت سے مانا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ کشان اور شک دونوں ہی وسط ایشیا کے دو مختلف انسانی گروہ تھے۔ امکان یہ ہے کہ شک لفظ غیر ملکیوں کے لیے ایک نسلی علامت کے طور پر اور کشانوں سے شروع ہونے والے عہد کے روپ میں استعمال کیا جانے لگا۔

Summary — 7.10 خلاصہ

یہ واضح ہے کہ تاریخ کا شعور، اگر ہم اس کے معنی ماضی کے بارے میں معلومات کا حصول لیں، تو قدیم ہندوستان میں پوری طرح موجود تھا۔ تعین زمانہ کے لیے کئی طریقہ کار تھے جو عام طور سے رائج تھے۔ اس طرح کے کتبے پورے برے صغیر میں پائے گئے ہیں۔ ان کتبوں اور متنی روایات کے وسیلے سے ہمیں یہ علم ہوا کہ ماضی کے بارے میں خاص طبقوں کا ذہنی رویہ کیا تھا اور وہ ریکارڈوں کی حکمت عملی کے ذریعے اس کا صحیح غلط استعمال کس طرح کرتے تھے۔ ان میں سرپرست کی سخاوت کا ذکر ہوتا تھا جیسے ویدک دانستیتاں میں سلسلۂ نسب کی ترتیب بھی سیاسی ضرورتوں کے مطابق ہوسکتی تھی اور بہت ہی تخلیقی طریقہ سے اس کو پھیلا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ حکمراں حیثیت کے دعوے کرنے کے لیے مخصوص اصناف کو بھی رواج دیا گیا تھا۔ جیسا کہ پرشتیوں اور چرتوں سے واضح ہے۔ ان کے علاوہ دیگر روایات بھی ہیں۔ کلہن کی راج ترنگنی حالانکہ راجاؤں سے متعلق اور ان کے بارے میں تھی لیکن اس کا اسلوب اور لہجہ جداگانہ تھا۔

جب ہم غیر اشرافیہ گروہوں کی تاریخ تلاش کرتے ہیں تو ہمیں بہت سے مسائل سے الجھنا پڑتا ہے۔ یہ کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کی ضمنی دلچسپیوں کا موضوع تھا جنھوں نے کچھ تحریری روایات قائم کیں جن کا ہم نے تجزیہ کیا۔ اس طرح تاریخ نویسی کی متمول لیکن محدود روایات کا ہمیں کچھ احساس ہوتا ہے۔

Exercises — 7.11 مشقیں

(1) درج ذیل پر نوٹ لکھیے۔

(الف) ویدک دانستیتاں (ب) چرت (ج) پرشتیاں

(2) پرانوں کے سلسلۂ نسب کی روایت پر روشنی ڈالیے؟

(3) کلہن کون تھا؟ اس کے تاریخی کاموں سے بحث کیجیے

(4) قدیم ہندوستان کے مختلف شاہی خانوادوں میں مستعمل تعین زمانہ کے طریقہ کاروں پر نوٹ لکھیے۔

Suggested Readings — 7.12 مجوزہ کتب

V.S. Pathak, Ancient Historians of India (London, Asia Publishing House, 1963).

C.H. Philips (ed), Historians of India, Pakistan and Ceylon (London, Oxford University Press, (1961) 1967.

Romila Thapar, Cultural Pasts: Essays in Early Indian History (New Delhi, Oxford University Press, 2000

A.K. Warderm An Introduction to Indian Historiography (Bombay, 1972)

یونٹ 8: قرون وسطیٰ میں تاریخ نویسی-مغربی
Medieval Historiography-Western

Structure | **خاکہ**

8.1 Introduction	8.1 تعارف
8.2 Christian Historiography	8.2 مسیحی تاریخ نویسی
8.3 Changing Concept of Time and Historiography	8.3 وقت کا بدلتا ہوا تصور اور تاریخ نویسی
8.4 Historians and their Works	84 مورخین اور ان کے کارنامے
8.5 Summary	8.5 خلاصہ
8.6 Exercises	8.6 مشقیں
8.7 Suggested Readings	8.7 مزید مطالعے کے لیے امدادی کتب

8.1 تعارف Introduction

قرون وسطیٰ کے یورپ میں Historia اور Chronica دو اصطلاحیں رائج تھیں جو ماضی کے تواتر (Sequencing) اور ماضی کے واقعات کے بیان کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ Isidore of Seville (560-536) کی مشہور تعریف کے مطابق Historia واقعات کے بیان کو کہتے ہیں۔ اگر Historia پہلے صرف واقعات کے بیان کے لیے استعمال ہوتا تھا تو Chronica (وقائع) کے استعمال میں آنے سے اس کے معنی میں وسعت آئی۔ جس سے تاریخ کے ساتھ تاریخ نویسی کے معنی بھی وابستہ ہوئے یا ماضی کے وقائع قابل توضیح ہوئے اس نے تاریخ کو دونوں اصطلاحی معانی اور مواد کا توافق عطا کیا، تاریخ نویسی کو حال سے ماضی کو جوڑنے کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا جو روئداد میں شامل حکایات کا دانشورانہ انداز میں بیان تھا۔ اس لیے ابتدا میں مسیحی تاریخ نویس حقائق کے موزوں اوصاف اور ان کی متوازی تواریخ، وقت اور صحیح سلسلہ وار بیان سے گہرا شغف رکھتے تھے۔

8.2 مسیحی تاریخ نویسی Christian Historiography

قدیم ترین مسیحی تاریخ عالمگیر تواریخ تھی جو بائبل تاریخ (جو ارضی حقائق کی رو سے بالکل صحیح نہیں تھی) کو قدیم روائداد میں ضم کرنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے مقصد سے لکھی گئی تھی اور جو مسیحیت سے قبل کے ماضی اور مختلف ادوار پر محیط تھی۔ یوروپ میں عصری سیاسی ترقی، وسیع جاگیردارانہ حکمرانوں کی اصولی تشکیل اور بادشاہت نے بھی تاریخ نویسی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس طرح تاریخ نویس کو مختلف مسیحی اور سیکولر روایتوں میں اتحاد قائم کرنے کا فریضہ بھی انجام دینا پڑا۔ اس طرح میسٹر ایکہارٹ (Meister Eckhart) (1260-1329) نے عیسیٰ مسیح کو سالویشنل تاریخ (Solvational History) کا مرکز قرار دیتے وقت سیاسی اقتدار کی نئی تشکیل کو بھی حوالہ جاتی نقطے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ 1146 میں اوٹو آف فرائزنگ (Otto of Freising) (1111-1158) نے اپنی عالمی تاریخ The Two Cities تحریر کی۔ اگرچہ اس نے تاریخ کا مذہبی نقطۂ نظر اپنایا لیکن اس نے ہر کتاب کا اختتام تاریخ میں سیاسی تبدیلیوں کے بیان سے کیا۔ اس طرح اس نے دنیا کے عبوری دور کی نشاندہی کی۔ تاریخی حدود کی یہ سیال فہم قرون وسطیٰ کے عروج میں وقائع میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں دو تاریخ وار نظاموں کا غلبہ تھا۔ یسوع مسیح کی بعثت کا عہد اور بادشاہوں اور روحانی پیشواؤں کا ذکر۔ بہت سے وقائع نویسوں نے ان اجزاء میں حقیقی اور بیانیہ اتحاد قائم کرنے کی

کوشش کی اس سے فطری تبدیلی اور تاریخ کی عارضی فطرت پر اعتقاد کا نتیجہ برآمد ہوا کیوں کہ تمام ارضی چیزوں پر وقت ہی کی حکومت رہتی ہے۔ عہد وسطیٰ کے وقائع نویسوں کے لیے تاریخی تبدیلی حکومتوں اور ولی عہدوں کی ترقی وتنزلی کا ایک سلسلہ تھا۔

اس طرح ماضی کا عہد وسطیٰ کا تصور بالکل عجیب وغریب اور مبہم اور نقطۂ لا نیحل سے عبارت تھا جو کہ ایک طرف تاریخی ترقی میں اعتقاد اور دوسری جانب اس کے غیر مبتدل ہونے میں یقین رکھتا ہے۔ یعنی تاریخی تبدیلی وقت اور تاریخی حالات کا تسلسل ساتھ ساتھ۔ آخری تجزیہ میں اس میں ماضی کی سچی تاریخی تصویر کشی کے ادراک کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر بھی تاریخ وار ترتیب کی توثیق پر اس کے زور کی وجہ سے اس شعور کو مطلق لازمانی کے درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا ہے باوجود اس کے ہر گزرے ہوئے واقعے/زمانے کے مخصوص خصائص کی تخصیص کے شعور کی اس میں کمی تھی۔ مستقل ماضی کو ایک زمانی ترقی کے طور پر سمجھا گیا جو Seculum ارضی وقت کی ترسیل کا ذریعہ تھا۔ جس کا کردار اور جوہر غیر متبدل تھا۔ اس نے تاریخی واقعات کو ان کے وقت کے مطابق بیان کرنے کے عام رجحان کو جنم دیا جو کسی طرح اس کے مخالف رجحان کی ضد نہیں تھا جس میں ان واقعات کے موضوع مواد کو اس کی تاریخ وار ترتیب سے جوڑا جاسکتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں ماضی کے تصور کے مطابق وقت ارضی وجود کا ایک اہم حصہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ لافانی دنیا کی ایک علامت بھی تھا۔ تاریخ نویسیانہ فکر تاریخ کی مذہبی ضروریات سے مربوط تھی۔ تاہم تبدیلی واقع ہونے کی حقیقت بھی ناقابل تردید تھی۔ یہاں تک کہ بائبل میں بھی تین عالمی حکومتوں کی آمد و اخراج کا بیان ہے اور سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine (354-430) سے لے کر کوئی بھی مسیحیت کے آغاز سے واقع ہوئی یا ہونے والی تبدیلیوں سے انکار نہیں کرسکتا۔ سینٹ آگسٹائن نے بھی تاریخی تبدیلی کی قابل قبول توضیح پیش کی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ صرف خدا ہی لافانی ہے جب کہ ارضی دنیا میں تبدیلی انسانی وجود کے غیر مکمل ہونے کے نتائج کے باعث ہے۔

بائبل کو قرون وسطیٰ میں خالص مسیحیت کے اظہار کا صرف لفظی بیان نہیں بلکہ روحانی اجزا کی وراثت کا تاریخی خاکہ سمجھا جاتا تھا۔ مسیحی روایت کے مختلف متون کو بائبل میں یکجا کیا گیا تھا، اس نے تاریخ نویسی کے حوالہ جاتی خاکے/ڈھانچے میں ایک جامع تاریخ کو جنم دیا۔ جو ایک جامع علامتی نظام سے مرکب تھا۔ اس طرح تاریخ کو روایت اور نمائندگی کے ساتھ متحد کیا گیا۔ کیتھولزم کی قبولیت نے اس تاریخی بالادستی کو اور مضبوط کیا اور اس کے اساسی اجزا میں سے ایک خصوصیت اس کا عالمی مذہب ہونا تھا جس میں تخصیصیت پسند یا مخصوص گروہ کے اقدار اور اصولوں کی بہت کم جگہ تھی۔ اولین ترین مسیحی تاریخی کاموں میں واقعات کے سلسلہ وار بیان کو مذہبی کتب کے واقعات کو سیاسی واقعات سے جوڑنے اور انسانیت کی عالمی تاریخ کو تخلیق کرنا تھا۔ اگرچہ حکمرانوں کا الوہی اساس نظریہ مسیحی مذہب کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا تھا، ماضی کی تشکیل بیانات و حکایات سے ہوتی تھی۔ جو مقدس مذہبی کتب میں تحریر ہیں جس میں تخصیصیت پسند روایات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور جو صرف سیاسی گروہ میں بھر دی گئی تھی۔ مسیحی کلیساؤں نے یہ قانون نافذ کیا کہ ان کے معتقدین کے لیے مقدس یا الہامی کتاب روایات اور حق و انصاف کے لیے حتمی ماخذ ہے۔ اس طرح کلیسا کی تاریخ اب عالمی تاریخ بن چکی تھی۔

8.3 وقت اور تاریخ نویسی کا بدلتا ہوا تصور

Changing Concept of Time and Historiography

قرون وسطیٰ میں وقت کا شعوری تصور ہر تاریخ نویسی کے کام میں ایک ضروری جزو تھا۔ قرون وسطیٰ میں دینیات اور تاریخ کے ادغام سے ''وقت'' بالکل ارضی و دنیوی ہوگیا تھا (یہ ارضی وجود کی لاینفک صورت ہے) کیوں کہ یہ بلاواسطہ طور پر خالق کی تخلیقیت اور تخلیق کے جوہر سے جڑا ہوا تھا۔ اس طرح یہ ابدیت کے بالمقابل واقع تھا جو خدا کی طرح غیر زمانی اور غیر متحرک ہے۔ ارضی وقت کی اس عارضی حالت کو 12ویں صدی کی ابتدا میں ابدیت کے سائے سے تعبیر کیا گیا۔ یہ دنیا کے ساتھ شروع ہوا اور دنیا کے ساتھ ختم ہوگا۔ خدا کے وقت اور ارضی وقت کے درمیان یہ واضح فرق علم سنین کے تصور کی ترقی میں بہت اہم تھا جو تاریخ میں اور ایام کے قابل پیائش تسلسل سے متعلق ہے۔ یہاں تک کہ اصولی ربط بہت اہم تھا۔ اس لیے وقت تاریخ نویسی کے تشکیلی اجزا میں بہت ضروری تھا۔ ہگ آف سینٹ وکٹر (Hugnd of Saint Victor)

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE • MANUU • IMC LIBRARY • Hyderabad

(1094-1142) نے اپنے روزنامچے کی تمہید میں تاریخی حقائق کے تین مخصوص حالات کا ذکر کیا ہے۔حقائق کا علم خاص طور سے انہی تین پہلوؤں پر محیط ہے۔ وہ افراد جن کے ذریعے یہ کام ہوئے ہیں وہ جگہ جہاں یہ کیے گئے ہیں اور وہ وقت جب یہ کیے گئے ہیں۔ اس میں ایک اور تصور ''عمل'' کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے خاص بیانیے ان ہی چاروں اجزا کے ذریعے متعین کیے جاتے تھے اس لیے جگہ وقت اور تاریخ نہ صرف عہد وسطیٰ کی انسائیکلو پیڈیا کے موضوع تھے بلکہ کچھ روزنامچوں کے جدول سے نظام اوقات شروع ہوا تھا یا وقت کی اصولی بحث سے۔ عہد وسطیٰ کے تصور کے مطابق روزنامچوں کو حقائق کا بیان اور وقت کا تواتر سمجھا جاتا تھا۔

عصری تصور کے مطابق تاریخی وقت کے شمار میں پانچ اہم چیزیں تھیں جو تاریخ کو دوسری اصناف سے ممیز کرتی ہیں۔

1۔ حقائق کے انتخاب کے ذریعے: یعنی کسی مصنف کو ان ہی حقائق کا انتخاب کرنا پڑتا تھا جو یاد ہوسکیں اور اس سے تاریخ نویسی منفرد ہوئی۔

2۔ صداقت کو اکٹھا کرنے کا دعوی (سچے حقائق) اس کے ذریعہ وہ افسانہ سے ممیز ہوئی۔

3۔ ماضی کی خصوصاً منبع و مخرج کی جانچ و پڑتال کے ذریعے۔ یہ مستقبل کی پیش گوئی سے الگ تھی (پھر بھی اس کی اہمیت تھی یا اس کو ملحوظ رکھا جاتا تھا)

4۔ آئندہ نسلوں کے لیے ماضی کے معلوم حقائق کے ذخائر کو منتقل کرنے کے ارادہ کے ذریعے، اس کو تاریخ نویسی تسلیم کیا گیا تھا۔

5۔ تاریخی ترتیب کے ساتھ خاص پیش کش کے ذریعے اس نے اپنے صحیح کردار کو حاصل کیا۔

خاص بات یہ ہے کہ وقت کا یہ شعور مغربی یورپ کی تاریخ نویسی کی روایت میں کافی پہلے سے موجود تھا۔ وقت اور تاریخ نویسی میں اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھنے والے لائق تعظیم بیڈ (Bede) (672-735) کو اس کا روح رواں سمجھا جاتا ہے۔ ایک بار پھر اس تبدیلی کے سوتے بائبل کو تاریخی سند عطا کرنے کی کوششوں سے ملتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بائبلی روایات کی اتباع کرتے ہوئے بیڈ نے اپنی سابقہ تصنیفات کے لیے لفظ Chronica استعمال کیا تھا۔ 731 میں اپنی تصنیف Ecclesiastical History of the English People کے عنوان کے لیے روایتی لفظ Historia کا انتخاب کیا تھا تاکہ ماضی کے ذکر کے لیے اپنے مرکب طریقے کو ظاہر کرسکے۔ اس عمل سے بیڈ نے مسیحت سے قبل کی روایات لاطینی سے استفادہ کیا جہاں لفظ Historia ماضی کے سیکولر ذکر کے لیے استعمال ہوتا تھا جو مختلف ماخذوں کی مدد سے ترتیب دیا جاتا تھا جس میں الوہی عالم سے جدا انسانی دنیا کے واقعات کا بیان ہوتا تھا۔ لیکن بیڈ (Bede) نے ایک خاص ضروری وصف کو جوڑ کر Historia کے معنی کو وسعت بخشی جو وسط یورپی تاریخ نویسی کا سنگ بنیاد ہوا۔ یعنی Historia کا کلیسائی ہونا۔ اس طرح بائبلی روایات کو نبھاتے ہوئے اس نے کلیسائی تاریخ کے ذکر کو عالمگیریت میں ضم کیا۔ تاریخ کا یہ آخری مقصد ہمیشہ اس کے دماغ میں رہا۔ کم سے کم صداقت کے صحیح شعور کے لیے جس کا وہ کافی لحاظ رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ پہلا مورخ ہے جس نے A-D علم سنین کا استعمال کیا جو یسوع مسیح کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا۔ اور ایسا کرکے اس نے یورپ میں تاریخ نویسی میں وقت کے استعمال کا معیار قائم کیا۔ Historica Ecclesiatica اور علم سنین کی مقبولیت کے ذریعے اس طریقے کا عام استعمال ہوا۔ اس طرح اس نے برطانیہ پر رومی عالمگیریت کی جگہ علاقائی حکمرانوں کی حکومتوں میں تبدیلی کی سن کا تعین علم سنین کی مدد سے کیا۔ جو کہ روم کے انتظامی اداروں سے مختص نہیں تھا بلکہ اس کا مرکز یسوع مسیح تھے اور بنیادی سطح پر بیڈ نے مختلف دستیاب مواد کی اضافی اسنادی اقدار کو پرکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح اس نے عوام مرکز عصری زبانی روایات سے بالکل اصولی سفر کا سلسلہ شروع کیا۔ سینہ بہ سینہ منتقل روایتیں خاص گروہوں میں نسل در نسل منتقلی کے باوجود بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے اپنی افادیت اور صداقت قائم کیے ہوئے تھیں۔ اس کے برخلاف بیڈ عہد پارینہ کے آخری مورخین کی طرح ان متون کی تحریر و اشاعت میں منہمک تھا جن کے بارے میں وہ سمجھتا تھا کہ جو پڑھنے، نقل کرنے اور سمجھنے میں ان ترسیلی طریقوں کی خصوصیات کی بنا پر کسی ایک خاص گروہ تک محدود نہیں رہیں گے۔

8.4 مورخین اور ان کے کارنامے — Historians and Their Works

آثار قدیمہ کی طرح قرون وسطیٰ میں عصری تاریخ کا بہترین کام ان اشخاص کے ذریعہ ہوا جو خود ان واقعات میں شریک تھے جس کا

ذکر انھوں نے کیا۔لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جن مصنفین کی آج بڑی اہمیت ہے ان کے چند ہی مسودے دستیاب ہیں اور ان کے بیشتر ہم عصروں نے ان کی کوئی قدر نہیں کی۔ اس طرح کی تصنیفات میں جان آف سیلس بری (John of Salisbury)(circa 1115-1180) کی Historia Pontificalis (پادریوں کی تاریخ) تھی جو 52-1184 تک کے عہد کو محیط ہے۔ وہ اپنے عہد کے قابل قدر مصنفوں میں سے ہے جس نے اپنے پاپائی سروس کے عہد کے بارے میں لکھا ہے۔ بارہویں صدی میں یورپ میں سیکولر تاریخ نویسی کا آغاز ہوا جیسا کہ جیوفری ولہرڈوئن (Geoffroi de Villehardouin (1160-1213) اور ژای سردی جان ولے (Jean Sir de Joinville) (1224-1317)، ژاں فروئسرٹ (Jean Froissart))(1445-1509) یکے بعد دیگرے عہد بہ عہد مصنفوں کے کارناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔

یوروپ میں عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ عالمگیر مسیحیت کے معادیاتی (eschatological) امنگوں اور حقیقی دنیا کے معروضی حالات کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہی تنازعہ تھا جس نے ایک دوسرے مشہور وقائع نویس بشپ اوٹوفریزنگ (Bishop Otto of Freising) (c. 1112-58) اس وقت کے حکمراں کو نارد سوئم (King Conrad III) کو مجبور کیا کہ جنت سے نکالے جانے سے اس وقت تک کی انسانی تاریخ کی حزنیہ حکایات پیش کریں۔ The History of Two Cities کو Chronica کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس نے سات کتابوں پر مشتمل تاریخی واقعات بہم پہنچائے۔ جس میں اٹو (Otto) نے City of God کے مستقبل پر آٹھویں عمدہ کتاب کا اضافہ کیا۔ اٹو نے اپنی کتاب 1146 میں مکمل کی اسی سال دوسری صلیبی جنگ شروع ہوئی جس میں اس نے، اس کے بھتیجے اور مستقبل کے بادشاہ فریڈرک اور خود بادشاہ کونارڈ (King Conard) نے حصہ لیا۔ اٹو کے بیانات میں بادشاہوں، فرمانرواؤں کی کافور صفتی (Volatility) پر اظہار افسوس ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ اس کے زمانے میں یہ عمل کافی بڑھ گیا تھا۔ اس احساس کے باعث اٹو یہ یقین کرنے لگا کہ وہ اور اس کے ہم عصر وقت کی انتہا پر ہیں۔ دنیا کے خاتمے کے ساتھ بہت سی بنیادی تبدیلیاں واقع ہونے والی ہیں۔ اگر چہ اس نے انسانی کردار کو تبدیلی کی نشوونما اور اس کے اتباع میں کسی حد تک مختار مانا ہے۔ لیکن وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ تبدیلی وتغیر خدا کی طرف سے ہے۔ اس لیے یہ انسانی وجود کی نا قابلِ تغیر صفت ہے۔ اس طرح علم سنین City of God کے وجود میں آنے سے قبل خود ماضی میں ہوئی تبدیلیوں اور زندگی کی موجودہ صورتِ حال کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔

اس وسط یورپ کی تاریخ نویسی کی روایات میں تبدیلی کے زیر اثر عالمی تاریخ ایک قابلِ شمار، محدود پھر بھی ناپائیدار شئے کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ لیکن عالمی تاریخ کا یہ زاویہ جلد ہی مشکوک ہوگیا۔ دو وجوہات کی بنا پر یہ زاویہ مشکوک ہوا اولاً معادیاتی نظریہ کی پیشین گوئی کہ دنیا جلد ہی ختم ہونے والی ہے اس کے باوجود دنیا کا بظاہر مستقل باقی رہنا اور دوسرے یورپ میں ارسطو کے وقت کے متناہی عمل کے تصور کی مغرب میں 12 ویں اور 13 ویں صدی میں مقبولیت۔ پہلی وجہ علم سنین میں .A.D کے استعمال سے اور جامع ہوئی جس نے رومی حکومتوں کے غیر مستور اداروں کے ساتھ تاریخ نویسی میں مدد کی۔ اس طرح آخر کار یہ دنیا کے ارضی شہر کے محدود وجود کے معادیاتی عقیدہ سے متصادم ہوئی۔ 12 اور 13 ویں صدی میں ارسطو کے اصل کام کے عربی تراجم کے ذریعے یورپ میں ارسطو کے زمانے کی تعریف دوبارہ رائج ہوئی۔ ارسطو کے تصور کے مطابق وقت تمام چیزوں کو متحرک کرنے والا ہے جو تمام الوہی تخلیقات سے بلند ہے، وقت کے اس تصور کی مقبولیت کے نتیجے میں، وقت کے بغیر کسی چیز کا تصور مشکل ہوگیا تھا یہاں تک کہ روزِ محشر کے بعد بھی، دوسرے لفظوں میں اگر وقت سب سے مقدم ہے تو وقت کے باہر یا ماسوا کسی چیز کا وجود نا قابل تصور ہے۔ تبدیلی کے بغیر دنیا کا تصور ایک افسانہ اور صرف قیاس ہوگیا۔

وسط یورپ میں یا دداشتیں تاریخی روایات کا ایک اہم خزانہ یا ماخذ تھیں۔ ان میں پرستش بزرگاں اور اسلاف کی تعظیم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ابتدائی عہد کے وسطی یورپ میں اولین سیاسی گروہوں نے اپنے ماضی کی یادگاروں کی روایات پر زور دیا۔ ان سیاسی گروہوں میں حکمراں موروثی روایات کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے عمل میں شریک تھے۔ ان روایتوں میں برتاؤ کے طریقے اور روایتی گروہ سے متعلق نظریے اور تصور شامل تھے۔ اس لیے زبانی حکایتیں تھیں جن کے بارے میں یقین سے کہا جاتا تھا کہ یہ ماضی کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہیں جن کی صداقت اور قابل اعتماد ہونے کی سند قصہ گو/ حکایت بیان کرنے والے کے سماجی مرتبے سے متعین کی جاتی تھی۔ اس لیے یہ روایتیں وضع کردہ

INSTITUTIONAL ... CENTRE MANUU Hyderabad-34 LIBRARY

اصول، اقدار اور طرزِ عمل اور ایک گروہ کے افراد کے تصور اور نظریہ کی مکمل تشکیل کے لیے منتقل کی جاتی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے مختلف و متنوع ماخذ کے استعمال کی جانب رجحان ہوا۔

اٹو (Otto) کے کاموں سے یہ امور ظاہر ہیں جس نے اپنے ماخذ و مواد میں موجود اپنے وقت کے تاریخ وار ڈھانچوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ بائبل سے اس نے اپنے ابتدائی کاموں کے لیے دنیا کی عمر یا پیدائش کی جدول کو اخذ کیا۔ اوروسیس (Orosius) (d 417) سے اس نے روم کی ابتداء کی اور وہ دلائل جن کے ذریعے مسیحیت کے وجود میں آنے، پھیلنے اور باقی رہنے کی بحث، جس کے ڈانڈے رومی سلطنت سے ملائے جاسکتے تھے۔ لیکن یہ بیڈ ہی تھا جس سے اوٹو نے مسیح کی پیدائش کے بعد سالوں کے شمار کا خیال اخذ کیا تاکہ وہ اپنے بیانیہ کو پانچویں صدی سے آگے رومی حکومت کے اداراتی بحران سے آگے جاری رکھ سکے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے کہ 'میری تحریر کردہ چیزوں کے بارے میں شک و شبہ کے ازالے کے لیے یہ چاہے آپ کے ذہن میں ہو یا کسی اور تاریخ کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن میں ہو مجھے یہ مختصراً بتانا ضروری ہے کہ یہ معلومات میں نے کہاں سے حاصل کی ہے' یہ وطیرہ مورخین میں کافی مقبول ہوا آثار قدیمہ کے مورخین کے برخلاف قرون وسطیٰ کے مصنفین سرکاری دستاویز سے بیشتر حوالہ دینے سے کتراتے نہیں تھے۔ انگلینڈ میں عصری مورخین کے ذریعہ قانونی اور انتظامی ریکارڈ کا کافی استعمال ہوتا تھا جیسے روجر آف ہیوڈین (Roger of Hoveden) جس نے وقائع کو سرکاری ریکارڈ کے ایک مجموعے کے طور پر پیش کیا ہے جس میں مصنف کی اپنی رائے بہت کم ہے۔

عہد وسطیٰ کے یورپی تاریخ نویسی کا ایک بڑا اہم مسئلہ تاریخ کے تصور کا تھا جو صرف ایک جدولی ارتقا سمجھی جاتی تھی۔ تاریخی تبدیلیوں کو سیاسی عروج و زوال یا بادشاہت کی تبدیلی و منتقلی یا اقتدار کے مرکز کی مکانی تبدیلی سمجھا جاتا تھا اور تاریخی واقعات کو خاص مادی ارضی نظریہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان تبدیلیوں کو ان خاص تاریخی حالات میں آنکنے اور ان کی توضیح و تفہیم نہیں کی جاتی تھی۔ جیسے ساختیاتی تبدیلیاں، عصری میلانات میں تغیر، یا تاریخی صورت حال۔ وقت کے یک خطی تصور کے باعث مصنفین تاریخ کو ناقابل بازیابی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے نئے دور اور نئی تبدیلیوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے ان کے یہاں متبادل ماضی یا ہر عہد کی تاریخی خصوصیات کا کوئی شعور بالکل نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک جدید مورخ نے کہا ہے کہ 12 ویں صدی کا تعلق صرف ماضی کی ماضیت سے نہیں ہے بلکہ اس کی غیر زمانی بصیرت و تاثر سے ہے۔ اس طرح ماضی اور حال ایک مسلسل بیانیہ میں پروئے ہوئے تھے۔ ماضی کو حال کے آئینے سے اس حد تک دیکھنے کا ایک عام خطرہ سہو زمانی (anachronism) کا ہوسکتا ہے۔ مثلاً چارلی میگنے (Charlemagne) کو نہ صرف ایک فرنگی شہنشاہ کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ ایک سورما اور مجاہد کے طور پر بھی پیش کیا گیا۔ زار (Caesars) کے جرمنی پر حملہ کے بیان میں رومی کیمپ قرون وسطیٰ کے قلعے ہوگئے۔ فوجی دستے سپاہی ہوگئے۔ مجسٹریٹ وزیر اور جرمن خصوصیات کے حامل لوگ جرمن ہوگئے تھے۔

سہو زمانی کے معنی سے عدم واقفیت نے قرون وسطیٰ کے وقائع اور روئدادوں کی غیر مانوس واقعات کی وضاحت میں معاونت کی۔ اگر کوئی مذہبی گروہ کوئی تاریخی بیانیہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس نے آسانی سے دستیاب کام کی نقل کرلی۔ یہ سلسلہ مخطوطے کے نئے خزانے تک رہا اور پھر اس مرتب نسخے کو نقل کیا گیا اور بعد کے آنے والے مصنفین نے اس میں مزید تبدیلی کی، اس لیے کم سے کم چھ نسخے ہیں جو Anglo-Saxon Crhonicales کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان تمام کا ماخذ West Saxon کی راجدھانی Winchestor میں رکھے ہوئے 892 کے ایک وقائع (Annal) پر ہے۔ زمانۂ حال کو رومی سلطنت سے جوڑنے کے رجحان اور تسلسل پر قرون وسطیٰ میں زور تاریخ کے تصور کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو صحیح تاریخی وقت کو متعین کرنے اور لکھنے کے رجحان کی ضد نظر آتا ہے۔

ایک طرف مصنفین تبدیلی و ترقی کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کا ذکر کرتے ہیں اور تاریخ میں عہد اور مرحلے میں فرق کرتے ہیں، دوسری جانب واقعات کے متعلق ان کے ادراکات ابدیت کے متعجب خیز شعور سے متاثر ہیں جو عہد کے کردار اور ان میں اصل فرق کو نظر انداز کرتا ہے۔ جہاں یہ اقتدار کی سیاسی منتقلی، حکومت اور بادشاہت سے پرے جاتا ہے۔ اس کے برخلاف یہ ماضی بعید کے واقعات کو بلا واسطہ حال پر منطبق کرتا ہے۔ بازنطینی (Byzantines) اور مسلمانوں سے رابطے نے مغرب کو دوسرا نظریہ دکھا کر تاریخ نویسی کو وسعت بخشی۔ بازنطینی مورخین نے وقائع نویسی کی شکل میں تاریخ نویسی کی صنف کا کافی استعمال کیا اگرچہ بازنطینی سلطنت کی متحدہ تہذیب کی ثابت قدمی نے بازنطینیوں کے کاموں کو کچھ

ادبی صفات سے متصف کیا۔ عہد وسطیٰ کے مسلم مورخین جیسے ال تبری المسعودی نے عمدہ تاریخیں لکھیں۔ حقیقت وفسانے میں فرق کے لیے اکثر و بیشتر جدید ترین اصول اپنائے لیکن ابن خلدون ان میں سب سے بڑا عہد وسطیٰ کا عربی مورخ ہے، جس نے شہروں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کے بیان کے لیے ساجیاتی تاریخ کے تصور کی تخلیق کی۔ پندرہویں صدی کے دوران دنیا کی بدلتی ہوئی تاریخ کے طور پر ماضی کا بیان جغرافیائی خصوصاً دنیا کی بحری تلاش کے ساتھ بلاواسطہ ملا ہوا تھا۔ دنیا کا یہ بحری سفر ہندوستان کے سمندری راستے کی تلاش یا مفروضہ جنوبی براعظم کی تلاش، جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ افریقہ اور ایشیا کو جوڑتا ہے۔ یورپ کے زمینی سطح پر براعظموں کی تکثیریت کو مزید تسلیم کر لینے سے قرون وسطیٰ کی روایتی عالمی تصویر اور سنین کی اعداد وشاری اور ماضی کے ذکر و بیان کی عجیب وغریب شکل ہو گئی تھی۔ اگرچہ مغربی تاریخ نویسی کی روایتوں کی بنیادیں کلاسیکی آثار قدیمہ اور مسیحیت کا تسلسل تھیں۔ بعد کے عہد وسطیٰ نے ان ذخائر کو اپنایا اور زیادہ وسیع مواد اور قطعی تاریخی ترتیب کے ساتھ اس کو آگے منتقل کیا۔ یورپ کے ساحلوں کو چھونے والے دوسرے گہرے اثرات بھی قبول کیے۔ اس لیے یہ تنقید غیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد وسطیٰ کے مورخین تاریخی تبدیلی کے عمل کی طرف کم متوجہ تھے اور وہ یہ تصور کرنے کے اہل نہیں تھے کہ پہلا دوران کے دور سے بالکل مختلف ہے۔

8.5 خلاصہ Summary

مذکورہ باب میں ہم نے عہد وسطیٰ کے یورپ میں تاریخ نویسی کی روایت کی ابتدا وعروج پر بحث کی ہے۔ عہد وسطیٰ کے یورپ میں تاریخ نویسی کلیسائی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ان تواریخ میں وقت کا ایک تصور تھا جس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ یہ الوہی وقت تھا۔ آہستہ آہستہ وقت کے تصور میں تبدیلی آئی۔ مسیحیت سے قبل کی تاریخ نویسی کی روایات سے متاثر ہو کر مورخین نے وقت کے اور زیادہ ارضی ہونے کے حوالے سے اس پر غور کرنا شروع کیا جو کہ قابلِ پیائش تھا۔ فکر کی اس تبدیلی نے تاریخ نویسی میں علم سنین کے استعمال کو ممکن بنایا۔ دوسرے علاقوں جیسے بازنطینی اور عرب ممالک کے روابط سے دوسرے اثرات مرتب ہوئے جن سے وسط یورپی تاریخ نویسی کو فائدہ پہنچا۔

8.6 مشقیں Exercises

1۔ عہد وسطیٰ میں مغرب میں وقت کے بدلتے تصور پر بحث کیجیے۔ اس نے تاریخ نویسی کو کیسے متاثر کیا؟

2۔ مسیحی تاریخ نویسی پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ عہد وسطیٰ کے یورپ کے کچھ اہم مورخین اور ان کے کارناموں پر ایک نوٹ لکھیے۔

8.7 معاون کتب Suggested Readings

Donald R. Kelley, ***Versions of History from Antiquity to the Enlightenmen*** (New Haven, 1991).

R.G. Collingwood, *The Idea of History* (Oxford, 1946).

Beryl Smalley, *HIstorians in the Middle Ages* (London, 1974).

Denys Hay, ***Annalists and Historians: Western Historiography from the Eighth to the Eighteenth Centuries*** (London, 1977)

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY Acc. No. MD-0416 Dt. 03.08.2015 HYDERABAD

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad-32

 REFERENCE ONLY

یونٹ 19: استعماری تاریخ نویسی

Unit 19: Colonial Historiography

Structure | خاکہ

19.1 Introduction	19.1 تعارف
19.2 Influential Works of History in Colonial India	19.2 استعماری ہندوستان میں موثر تاریخی تحریریں
19.3 Some Other Historiographic Developments	19.3 تاریخ نویسی کے ذیل میں دیگر پیش رفت
19.4 Colonial Ideology in Historiography	19.4 تاریخ نویسی میں استعماری نظریات
19.5 Impact of Historical Writings in Colonial India	19.5 استعماری ہندوستان میں تاریخی تحریروں کے اثرات
19.6 Summary	19.6 خلاصہ
19.7 Exercises	19.7 مشقیں

Introduction — 19.1 تعارف

جب ہم استعماری تاریخ نویسی کے بارے میں بات کریں تو سب سے پہلا کام اس کے معنی کی وضاحت ہے۔''استعماری تاریخ نویسی'' کی اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے (الف) استعماری راج کے عہد میں آبادکار ممالک کی تاریخ (ب) اوران مورخین کے مشترکہ نظریات وطرز رسائی جن کی خصوصیت استعماری نظریات ہیں۔ انگریزوں کے ہندوستان میں اس اصطلاح کا استعمال صرف پہلے معنی میں ہوتا تھا اور آزادی کے بعد دوسرے معنی میں اس کا استعمال شروع ہوا۔ بہت سے صف اول کے مورخین انگریز استعماری آفیسر تھے اور استعماری تاریخ کی اصطلاح تاریخ میں شامل نظریہ کے بجائے موضوع کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ آج یہ نظریہ تنقید کا نشانہ ہے۔ اس لیے استعماری تاریخ نویسی کی اصطلاح تحقیری معنوں میں استعمال ہورہی ہے۔ اس یونٹ میں استعماری تاریخ نویسی کی اصطلاح کا استعمال مذکور دونوں معنوں میں ہوگا۔

ایک معنی میں استعماری تاریخ مطالعہ کے موضوع کے طور رپر اور استعماری طرز رسائی ایک نظریہ کے طور پر باہم منسلک ہیں۔ انگریزوں کی تاریخی تحریروں میں سلطنت سازی کے موضوع سے فطری طور پر ایسے نظریات سامنے آئے جو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو حق بجانب ٹھہراتے تھے۔ یہ توجیہ مختلف مورخین کے یہاں مختلف درجہ کی تھی۔ اس توجیہ میں بے حرمتی کی حد تک ہندوستانی سماج اور ثقافت کی جانب سخت تنقیدی رویہ اور ہندوستان پر قابض ہونے اور حکومت کرنے والے سپاہیوں اور منتظمین کی جانب توصیفی رویہ اور برطانوی سالمیت (Pax Britannica) سے ہندوستان کو ہونے والے فوائد کی تعریف کا میلان شامل ہے۔ اس نظریہ کا بالتفصیل مطالعہ ہم بعد میں کریں گے لیکن یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ نظریاتی پہلو کے شعور کی کمی استعماری تاریخ نویسی کا خاصہ تھا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اکثر اوقات میں لی پولڈوان رینکے (Leopold Van Ranke) اور تاریخ کے اثباتی مکتبۂ فکر نے ''مورخ کی معروضیت'' پر زور اور مورخین کے مباحث میں کسی نظریہ کی طرف جھکاؤ کے امکان کو مشکل کردیا۔ استعماری تاریخ نویسی کا نظریاتی پہلو آزادی سے پہلے تاریخ نویسی کے آزادی کے بعد کے ناقدین کے ذریعہ منظرِ عام پر لایا گیا۔ 1961 میں جاکر یہ تنقید خاص طور سے ہندوستان میں شروع ہوئی، اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز آف لندن کے سی۔ایچ فلپس (C.H. Philips) نے The Historians of India, Pallistan and Ceylon میں تاریخ نویسی کے جامع اورمبسوط سروے میں اس مسئلے کو بالکل بھی نہیں اٹھایا۔

19.2 استعماری ہندوستان میں تاریخ کی موثر تحریریں

Influential Works of History in Colonial India

تاریخ نویسی میں استعماری نظریہ کا سوال اٹھانے سے پیشتر ہمیں مطلوبہ مورخین کے خیالات کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اٹھارہ ویں صدی میں چند ہی مناسب تاریخی تحریریں تھی۔ شاید انگریز ہندوستانی سیاست کے بلند تر مقام پر پہنچنے میں اتنے مشغول تھے کہ ان کو تاریخ کی جانب توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ چارلس گرانٹ (Charles Grant) اٹھارہ ویں صدی کے تاریخ نویسوں میں ایک اہم نام تھا۔ اس نے 1792 میں Observation on the State of Society Among the Asiatic Subjects of India تحریر کی۔ اس کا تعلق انجیلی مکتبۂ فکر (Evangelical School) سے تھا۔ یہ انگریز مشاہدین کا ایک گروہ تھا جس کا ماننا تھا کہ ہندوستان کے حکام انگریزوں کا یہ الوہی مقدر ہے کہ وہ اس ہندوستان میں مسیحیت کی روشنی بکھیریں جو قدیم مذہبی اعتقاد اور توہم کے اندھیروں میں غرق ہے۔ تاہم انیس ویں صدی کی اوائل دہائی تک ہندوستانی سماج اور تاریخ پر اس طرح کی مفکرانہ تحریروں کی کمی ہے۔ انیس ویں صدی کی دوسری دہائی تک ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کافی مستحکم ہوگئی تھی اور توسیع کے ایک نئے عہد میں داخل ہونے والی تھی۔ 1815 تک نپولین اور فرانس پر فتح کے بعد برطانیہ یورپ میں ایک اول درجے کی طاقت کی حیثیت سے صرف قائم نہیں ہوا تھا بلکہ برطانیہ میں پہلا صنعتی انقلاب آچکا تھا اور دنیا میں ایک صنعتی طاقت بن کر ابھر چکا تھا۔ برطانیہ کا پوری دنیا میں سب سے بلندی پر ہونے کا اعتماد سب سے بہتر طریقے سے صرف ہندوستان پر انگریزوں کی تحریروں میں ہے اور کہیں نہیں، جب کہ وہ ہندوستان کو ایک محکوم پچھڑا ہوا اور غیر ترقی یافتہ ملک سمجھتے تھے۔ انیسویں صدی کی دوسری دہائی سے انگریزوں کی تاریخی تحریروں میں یہ نظریہ منعکس ہوتا ہے۔

اسی اثنا 1806 اور 1818 کے درمیان جیمس مل (James Mill) نے ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں تحریر کی اور یہ تحریریں ہندوستان کے بارے میں انگریزوں کی نظریہ سازی میں معاون ہوئیں۔ ایک کتاب کا نام History of British India تھا۔ جس کی پہلی تین جلدوں میں قدیم اور وسطی ہندوستان کا سروے شامل ہے جب کہ آخری تین جلدیں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے لیے مختص ہیں۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اور 1820، 1826 اور 1840 میں اس کو دوبارہ شائع کیا گیا اور ہیل بیوری میں ایسٹ انڈیا کالج میں تربیت پانے والے برٹش انڈین سول سروس آفیسروں کے لیے یہ اساسی درسی کتاب ہوگئی۔ 1840 کی دہائی تک یہ کتاب بے معنی ہوگئی اور اس کے مدیر ایچ۔ ایچ۔ ولسن (H.H.Wilson) نے (ولسن نے اس کتاب میں بہت سے غلط حقائق کی بھی نشاندہی کی تھی) 1844 میں اس کا خلاصہ کیا اس کے باوجود یہ کتاب کلاسیک ہی تصور کی جاتی رہی۔

مل (Mill) کبھی ہندوستان نہیں آیا اور اس کے کام کا سارا انحصار ہندوستان پر انگریزوں کی تحریروں کے محدود مطالعے پر تھا۔ اس میں ہندوستان کے تئیں تعصب بھرا ہوا تھا۔ یہ تعصب انگریزوں میں ہندوستان میں دوران قیام پیدا ہوا تھا۔ پھر بھی صداقت، واقعیت اور معروضیت کے نقطۂ نظر سے کمی کے باوجود یہ کتاب دو اسباب کی بنیاد پر کافی موثر تھی۔ اس میں سے ایک کو اکثر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جیمس مل (James Mill) کا تعلق ایک متاثر کن سیاسی و معاشی مکتبۂ فکر، افادیت پرست (Utilitarians) فلسفی جیرمی بینتھم (Jeremy Bentham) سے تھا۔ تاریخ کی افادیت پرست توضیح کی طرح مل کی ہندوستان کی تاریخ بھی ہندوستانی انگریز حکمرانوں کے لیے ضمناً ایک افادیت پرست ایجنڈا بھی ہے۔ کتاب کے موثر ہونے کی دوسری وجہ اس قدر نہیں تسلیم کی گئی جیسے کہ پہلی وجہ۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ یہ کتاب انیسویں صدی کی ابتداء میں اس زمانے کی ذہنیت کی اصلی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ ذہنیت یورپ میں بالادستی کے لیے لڑی گئیں۔ اینگلو-فرنچ جنگوں میں برطانیہ کی فتح اور برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعتی خوشحالی کے باعث ارتقاء پذیر ہوئی۔ جیمس مل نے پر اعتماد سامراج کا وہی پیغام پہنچایا جو انگلستان کے قاری سننا چاہتے تھے۔

حالاں کہ جیمس مل نے تاریخ کی افادیت پرست توضیح پیش کی تو اس کے برعکس ایک تاریخ ماونٹ اسٹورٹ الفی اسٹون (Mauntstuart Elphistone) نے لکھی جس کی فلسفیانہ گروہ بندی مشکل ہے۔ الفی اسٹون (Elphistone) نے اپنی نوکری کا کافی عرصہ ہندوستان میں سول

سرونٹ کے طور پر گذارا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کے لیے وہ مِل سے بہتر اہلیت اور معلومات رکھتا تھا۔ اس کی کتاب History of Hindu and Muhammedan India (1841) کو ہندوستانی یونیورسٹیوں (1057 سے وجود میں آئیں) میں ایک معیاری کتاب کا درجہ حاصل تھا اور اگلی صدی کے ابتدائی سالوں تک اس کی بار بار اشاعت ہوتی رہی۔ الفی اسٹون نے اس کے بعد History of British Power in East لکھی۔ اس کتاب میں ہیسٹنگ (Hasting) نظام تک برطانوی حکومت کی باقاعدہ توسیع اور استحکام کا منصفانہ ذکر ہے۔ الفی اسٹون کی طرز رسائی کے دیرپا اثرات کے نتیجے میں ہندوستانی تاریخ نویسی میں ہندو عہد اور مسلم عہد کی طرح قدیم اور وسطی کی عہد بندی کی روایت قائم ہوئی۔ خاص طور سے ہندوستان میں الفی اسٹون کا کام ایک ذی اثر درسی کتاب کی حیثیت سے باقی رہا لیکن جے۔ ٹالبوائز وہیلر (J. Talboys Wheeler) نے 1860 کی دہائی میں ماہر پیشہ ور کی طرح تاریخ لکھی۔ اس کی یہ جامع کتاب History of India پانچ جلدوں میں 1867 اور 1876 کے درمیان شائع ہوئی اور اس کے بعد Survey of India in British Rule (1886) تحریر کیا۔

اگر کوئی الفی اسٹونن کی ذی اثر کتاب کا ثانی تلاش کرے تو اسے شاید ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith) کی کتاب History of India کی جانب متوجہ ہونا پڑے گا۔ جو برطانوی سول سرونٹ مورخین کی صف میں سب سے پیچھے ہے۔ 1911 میں الفی اسٹون کی تاریخ Hindu and Muhammaden India کا آخری ایڈیشن شائع ہوا اور اسی سال وینسنٹ اسمتھ کی مبسوط تاریخ جس کی بنیاد اس کی پہلے سے قدیم ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق اور الفی اسٹون اور اس کے بعد کئی دہائیوں میں برطانوی محققین کی جمع کی ہوئی معلومات پر تھی، وہ منظرِ عام پر آئی۔ 1911 سے تقریباً بیسویں صدی کے وسط تک وینسنٹ اسمتھ کی کتاب کو تقریباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں ایک مستند نصابی کتب کا درجہ حاصل تھا۔ وینسنٹ اسمتھ کی کتاب کو ہیئت کے اعتبار سے پیشہ ورانہ تاریخ نویسی کے ضمرے میں رکھا جاسکتا ہے اور دستیاب معلومات کو یکجا کرنے میں یہ بے نظیر تھی اور ہندوستانی تاریخ کی طرز رسائی پر کچھ معنوں میں ہندوستان میں برطانوی سول سرونٹ کے تجربات کا اثر ہے۔ 1885 سے قومیت پرست تحریک کے آغاز اور 1905 میں تقسیم بنگال سے سیاسی مظاہروں میں شدت نے شاید ہندوستانی تاریخ کے بارے میں اس کے فیصلہ کو متاثر کیا مثلاً وہ ہندوستانی سالمیت کی نازکی، افراتفری کی ابتداء اور مضبوط سامراجی قوت کی عدم موجودگی میں عام زوال کی ابتداء کا بار بار حوالہ دیتا ہے۔ عظیم حکومتوں کے خاتمے پر قدیم اور وسطی ہندوستان میں انتشار، بکھراؤ اور زوال کا تجربہ ہندوستانی قارئین کے لیے ایک واضح سبق کی جانب اشارہ تھا۔ یعنی یہ صرف سامراج برطانیہ کے آہنی بازو تھے جو ہندوستان کو ترقی کے ساتھ پائیداری کے راستہ پر گامزن کیے ہوئے تھے اور اگر برطانوی سامراج وہاں سے ہٹ جائے تو وہاں ایک طوفان ہوگا جو برطانوی حکومت میں کی گئی تمام ترقیوں کا رخ پھیر دے گا اور جہاں تک اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے قومیت پرست تحریک کی صلاحیتوں اور ہندوستانی عوام کی اہلیت کا سوال ہے وینسنٹ اسمتھ اس سیاسی سوال پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں کرتا۔

برطانوی حکومت کے آخری سالوں میں سیاسی سوال کو کافی اہمیت حاصل ہوئی اور 1934 میں ایک تاریخی کام منظر عام پر آیا جس میں ہندوستانی قومیت پرست تحریک کے سیاسی نظریہ کو کافی جگہ ملی۔ Rise and Fulfilment of British Rule in India پہلے مذکور تمام کتابوں سے مختلف تھی۔ یہ کتاب لبرل نظریہ سے لکھی گئی اور ہندوستانی قومی آرزوں کی جانب کافی حد تک ہمدردانہ رویہ اپنایا گیا۔ ان مصنفین میں ایک ایڈورڈ تھامپسن (Edward Thompson) ایک مشنری جس نے کافی سالوں تک بنگال کے ایک کالج میں پڑھایا اور ربندر ناتھ ٹیگور کا اچھا دوست تھا، اور دوسرا جی۔ ٹی گیراٹ (G.T. Garratt)۔ جس نے گیارہ سال تک ہندوستان میں سول سرونٹ اور اس کے بعد انگلستان میں لیبر پارٹی کا سیاستداں تھا۔ یہ دونوں اولین ایام کے سول سرونٹ مورخین کی قائم کردہ خطوط کی اتباع کے لیے تیار نہیں تھے۔ تھامپسن اور گیراٹ (Thompson and Garratt) کو برطانوی دقیہ نوس رہنماؤں کی زبردست تنقید کا سامنا تھا۔ دوسری جانب بہت سے ہندوستانیوں کو یہ کتاب سرکاری عائد کردہ کتاب کے مقابلے زیادہ قابل قبول تھی۔ یہ کتاب ہندوستان کی آزادی ملنے سے کم از کم پندرہ سال پہلے شائع ہوئی۔ برطانوی لبرل اور ترقی پسندوں کی سرکل میں فکر کی نئی سمت متعین کرنے میں اس کتاب کو سنگ میل کی حاصل ہے۔ یہ اس ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہے

جس نے 1947 کے عبور کو اب تک کی سامراجی قوت کے لیے قابلِ قبول بنایا۔

جیمس مِل سے لے کر تھامپسن اور گیراٹ تک تاریخ نویسی نے کافی مسافت طے کی۔ یہ عہد انیسویں صدی کے ابتداء سے لے کر ہندوستان میں برطانوی حکومت کے آخری سالوں کو محیط ہے۔ اس عہد نے یورپی مرکزیت (Euro-Centric) اور تحقیرانہ رویہ سے مزید لبرل ہندوستان اور کم نسلیاتی -مرکزیت (Ethno-Centnric) رویہ میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

19.3 تاریخ نویسی کے ذیل میں دیگر پیش رفت

Some Other Historiographic Developments

ابھی تک ہماری توجہ ان تواریخ پر تھی جو زیادہ پڑھی گئیں اور جن کو درسی کتب کا درجہ حاصل ہوا اور اسی لیے تاریخی تصور و سمجھ کو متاثر کیا۔ اس کے برعکس کچھ دوسری تاریخی تحریریں ہیں جن کو تاریخ نویسی میں اہمیت حاصل ہے۔

انیسویں صدی کے وسطی دہائیوں میں دو عظیم مصنفین نے ہندوستان پر لکھا لیکن ہندوستان درحقیقت ان کی پسند کا مرکز نہیں تھا۔ ایک لارڈ میکلے (Lord Macaulay) تھا جس کے رابرٹ کلائیو (Robert Clive) جیسی عظیم برطانوی ہندی شخصیات پر مضامین ایڈن برگ ریویو (Edinburgh Review) میں شائع ہوئے۔ میکلے کے ادبی اسلوب نے ہندوستانی تاریخ کو قابلِ مطالعہ بنایا گرچہ برطانوی ہندوستان کے اصل حصے کے بارے میں اس کی کم معلومات اور زیادہ کمزور فیصلے کے باعث ان مضامین میں کافی کمی تھی۔ یہ جیمس مِل کی بہت ہی بے کیف اور مین میکھ نکالنے والی تحریروں سے بالکل مختلف تھی۔ میکلے (Macaulay) کا دیرپا اثر ہندوستانی تاریخ نویسی میں سوانحی انداز کی تاریخ لکھنے کی روایت کا قیام ہے۔ اس کی کافی اتباع کی گئی۔ اس لیے مختلف وائس رائے اور ان کے مانند لوگوں کی سوانح اور ان کے نظام کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی گئی۔

سر ہنری مینے (Sir Henry Maine) کی خدمات بالکل مختلف ہیں۔ مینے امور عدلیہ کا ایک عظیم مورخ تھا جس نے ہندوستان میں گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر ہونے کی قلیل مدت کو قدیم ہندوستانی ادارہ جات کا مطالعہ کرنے میں لگایا اس کی کتاب Ancient Law (1861) اور ہندوستان دیہی کمیونٹیوں پر اس کے کام سے تاریخ میں نئے مضامین کی ابتداء ہوئی تھی۔ مینے نے قوانین اور اداروں کو رومی قانون (Roman Law) کے غلبہ سے پرے دیکھ کر قانون کی ترقی کے بارے میں یورپی فکر کے دھارے کو بدل دیا۔ پھر بھی قانونی اور ادارہ جاتی تاریخ میں کچھ برطانوی-ہندی اسکالرس کے کچھ قابلِ ذکر کام مینے کی روایت کی اتباع میں ہیں۔ آخر انیسویں صدی میں یورپی عالمانہ کاموں تک اس کے اثرات محدود ہیں اور شاید اس کے علاوہ میکس ویبر (Max Weber) اور دوسروں کے ذریعہ علم ساجیات کی ترقی میں بھی اس کے اثرات ہیں۔

برطانوی-ہندی مصنفین نے قانونی تاریخ کے میدان میں جو بھی کتابیں لکھیں وہ معیار میں مختلف اور درحقیقت مینے کی تحریروں سے کمتر درجہ کی تھیں۔ جیسے سر جیمس فٹز جیمس اسٹیفن (Sir James Fitz James Stephen) جو وائسرائے کونسل کا لا ممبر تھا، کے وارن ہسٹنگ کے عہد میں برطانوی نظام کے دفع میں لکھا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ ایڈمنڈ برک (Edmund Burke) کی یہ سوچ غلط تھی کہ جسٹس ایلیجاہ اِمپے (Elijah Impey) نے نند کمار کو جو سزا دی تھی وہ قانونی نظام کی ناکامی کا معاملہ تھا۔ یہی اسٹیفن کی Story of Nuncoomar and the Impeachment of Sir Elijah Impey (1885) کا موضوع تھا۔ اسی کے ردعمل میں ایک آئی۔سی۔ایس آفیسر ہنری بیورج (Henry Beveridge) نے مواخذہ کی تائید اور شنوائی اور نند کمار کی سزا کی مزمت میں Nanda Kumar: a narrative of a Judicial Murder (1886) لکھی۔ اسی طرح ایک دوسرے آئی۔سی۔ایس آفیسر سر جان اسٹریچے (Sir John Strachey) نے سابقہ برطانوی نظام کے دفع میں ہی Hastings and the Rohilla War (1892) لکھی، وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings) اور اس کا مواخذہ اور برطانوی نظام کی ایڈمنڈ برک کی تنقید ماضی میں قانونی تاریخی مباحث تھے۔ اس طرح کے مباحثہ کا اصل موضوع تاریخ تھا لیکن پس پردہ موجودہ

عہد تک برطانوی قبضہ اور ہندوستانی نظام اس کے موضوع تھے۔ جس کا اندراج درست تھا اور اس پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی تھی۔

بادشاہت کا ستارہ بلندی پر ہی تھا کہ تاریخ نویسی کے دو بہت ہی متضاد رجحان دو اہم مصنفوں کے ذریعہ منظرِ عام پر آئیں۔ ان میں ایک سرولیم ہنٹر (Sir William W. Hunter) تھا جو گزٹیر (Gazetteers) کا ایڈیٹر اور برطانوی ہندوستان کی تاریخ پر عام کتاب کا مصنف ہے۔ 1899 سے اس نے The Rulers of India نامی کتاب کی سیریز کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سیریز نے ہندوستان میں بادشاہت کے معماروں کی تعریف کی خاص کر برطانوی ہندوستانی بادشاہت کے معماروں کی برائے نام اس میں ایک دو ہندوستانی معماروں -اکبر اور اشوک کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔ اس سیریز کو حکومت کی کفالت حاصل تھی اس کی مختلف جلدیں سرکاری کتب خانوں اور نصاب کا حصہ ہیں۔

عام انداز میں تاریخ پیش کرنا مقصد تھا۔ سلطنت کے معماروں کے عمدہ کارناموں اور گھروں میں ان کے بچپن کے حسین واقعات کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ بقائے دائمی کے لیے سلطنت کے قومی معماروں کو سوانحی انداز میں پیش کیا گیا۔ ہندوستان سے ہمدردی رکھنے والے برطانوی سول سرونٹس کو اس میں شامل نہیں کیا گیا اور یہ اٹھارہویں صدی میں سوانحی کے انداز میں برطانوی تاریخ نویسی کی روایت کا خاکہ ہے۔

سر الفرڈ لائل (Sir Alfred Lyall) کی تحریر Rise and Expansion of British Dominion in India (1894) برعکس تصویر پیش کرتی ہے۔ کیوں کہ اس کے طریقہ کار اور ترجمانی میں کافی اصلیت ہے گرچہ اس کی ترجمانی کے انداز سے بنیادی طور پر نا اتفاقی ہوسکتی ہے۔ ایک نسلی جغرافیہ داں (Ethnographer) کی طرح ماضی کے واقعات اور عمل کو سمجھنے کے لیے اس کا مشاہدہ، موجود ہندوستانی سماج، ریت و رواج، اداروں، وغیرہ کی معلومات کا استعمال اس کے طریقہ کار کی اصلیت کے اسباب ہیں۔ اس طرح وہ متنی شواہد جن پر اس وقت کے مورخین کا تکیہ تھا، سے آگے گیا۔ ہندوستانی تاریخ کی ترجمانی کے لیے لائل (Lyall) نے بڑے وسیع کینوس پر تصویر پیش کی۔ یونان اور روم کے زمانے سے مشرق ومغرب کے مابین تعلقات کی پوری تاریخ کی روشنی میں اس نے برطانیہ کے ہندوستان پر حملے کو دیکھا۔ تاریخ کا یہ وسیع پھیلاؤ کچھ معاملوں میں آرنالڈ ٹوآن بی (Arnold Toyn Bee) کے تہذیبوں کے مابین تعلقات کے وسیع النظر عالمی رویاء کے مشابہ ہے، اور انیسویں صدی کے اکثر برطانوی-ہندی مورخین سے مختلف ہے۔ لائل میں اصلیت کا تیسرا عنصر اس کا یہ نظریاتی موقف تھا کہ ہندوستان اور یورپ ترقی کے ایک ہی ڈگر پر تھے لیکن ہندوستان کی ترقی ایک خاص مرحلے میں روک دی گئی۔ یہی سر ہنری مینے کا بھی موقف تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ''ہندوستانی سماج میں ہماری تہذیب کا، اس کے عناصر کے ساتھ عظیم حصہ ہے۔ جو ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے۔'' ہندوستان ایک ''محصور تہذیب'' کی حیثیت سے یورپ میں ایک موثر فکر تھی لیکن ہندوستان میں اس کے چند ہی پرستار تھے۔ قومی عصبیت کے حامل دانشوروں نے اس خیال ہی کو رد کردیا کہ ہندوستان یورپ کا پچھڑا ہوا پرتو ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان سماج و ریاست کی تنظیم و نظام میں یورپ سے کافی مختلف ہے اور ہندوستان کو یورپ کی نقل کرنے کے بجائے ایک مختلف تاریخی مقدر کے حل کی اجازت ہونی چاہیے۔ کچھ معاملات میں لائل کے تفہیمی اصولوں پر سوال اٹھایا جاسکتا ہے لیکن کسی بھی صورت ہندوستان کو ایک تہذیب کی شکل میں اس کے دیکھنے کی کوشش قابل تسلیم ہے۔

آخر کار انیسویں صدی کی پہلی دو یا تین دہائیوں میں تاریخ نویسی میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا اور معاشی تاریخ میں تحقیق و آزمائش شروع ہوئی۔ پہلے ہی بہت سے برطانوی سول سرونٹس نے اس کی بنیاد رکھ دی تھی جنھوں نے معاشی ریکارڈ کو جانچا تھا اور زرعی تعلقات اور زراعتی تاریخ کے دھارے کے بارے میں وسیع نتائج اخذ کیے تھے۔ انھوں نے ایسا ڈسٹرکٹ کلکٹر یا مجسٹریٹ کی حیثیت سے (Land Revenue Settlement) کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کیا تھا۔ اس میں حکومت کو اراضی کے محصول کی اصولی کا اہل بنانے کے لیے زراعتی آمدنی پر ٹیکس متعین کیا جاتا تھا۔ ان سرونٹس میں ایک اہم مورخ ڈبلو ایچ مورلینڈ (W.H. Moreland) تھا جس نے معاشی حالات کا جائزہ India at the Death of Akbar میں پیش کیا۔ یہ 1920 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس نے معاشی تاریخ پر ایک دوسری کتاب The Agrarian System of Mughal India (1923) تحریر کی اور آخر میں ایک تاریخ From Akbar to Aurangzeb (1929) لکھی۔ مورلینڈ (Moreland) کا پہلے سے یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی معاشی حالت عہد وسطی کے مقابلے برطانوی حکومت میں زیادہ بہتر تھی۔ اس خیال کے باعث اس کے طرز رسائی میں کچھ کمیاں تھیں۔ اور اس خیال کو ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنی تحریروں میں مختلف

طریقے اپنائے۔ بیسویں صدی میں ہندوستانی معیشت پر تحریروں میں بھی۔ علاوہ ازیں برطانوی معیشت کے اثرات کا ہندوستانی قومیت پرست معاشیاتی ناقدین کی جانب مورلینڈ کا ردعمل بالکل مناسب نہیں تھا۔ ویرا اینسٹے (Vera Anstey) اس کی ایک جونیئر ہم عصر تھی۔ اس نے بھی انہی خطوط پر لکھا۔ یونیورسٹی آف لندن میں وہ استانی تھی اور ایک معیاری درسی کتاب The Economic Development of India (1929) تحریر کی۔ لیکن اس کی تحریر میں وہ تاریخی گہرائی نہیں ہے جو مورلینڈ کے یہاں تھی۔ مورلینڈ کا ایک اہم کارنامہ معاشی تاریخ کے نئے مضمون کی بنیاد تھا۔ پھر بھی مخصوص استعماری مورخین کی معاشی اور سماجیاتی تاریخ میں بہت ہی کم دلچسپی رہی۔ یہ برطانوی ہندوستان پر ڈیوڈ ڈویل (David Dodwll) کی مرتبہ Cambridge Historoy of India (1929) اور پی۔ای۔رابرٹ (P.E. Robert) کی کتاب History of British India (1907 سے کئی ایڈیشن آئے) میں تمام برطانوی مورخین کے کلاسیکی تلخیص سے واضح ہے۔ نا تو ہندوستانی معیشت اور سماجی حالات اور نا ہی ہندوستانی عوام ان کی تحریروں میں توجہ کا مرکز تھے۔ ان کی تاریخ صرف ہندوستان میں برطانوی فوجوں اور سول سرونٹس کے کارناموں کے بارے میں تھی۔

19.4 تاریخ نویسی میں استعماری نظریہ

Colonial Ideology in Historiography

تمام برطانوی تاریخی تحریروں کو ایک جانب سے نوآبادیاتی کہنا غلط ہوگا کیوں کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں استعماری مکتبۂ فکر میں مختلف طرز رسائیاں اور تفہیم کے اصول وضع ہوئے۔ تاہم اب تک سروے کیے گئے اکثر کاموں میں کچھ مخصوص مشترکہ خصائص ہیں یہ گرچہ بہت عام ہیں لیکن ان خصائص کا خلاصہ مفید ہوگا۔

- ہندوستان کا ''مستشرقی'' بیان عام تھا جدید مغربی تہذیب کی برتری کے نظریہ کی حمایت کرتا تھا۔ حال ہی میں ایڈورڈ سعید اور دوسرے لوگوں نے اس موضوع کو نمایاں کیا۔ لیکن ہندوستانی قومیت پرست دانشوروں نے جیمس مل اور اس کے بعد کی برطانوی تحریروں میں اس رجحان کی نشاندہی کی اور تنقید کا نشانہ بنایا۔
- تمام تاریخی بیانیوں میں یہ خیال کہ جب تک برطانیہ نے ہندوستان کو متحد نہیں کیا وہاں کوئی اتحاد نہیں تھا، کو مشترکہ طور پر نمایاں کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی اٹھارہویں صدی ''تاریک صدی'' کے طور پر پیش کی جاتی تھی جو بچاؤ کے لیے انگریزوں کے آنے سے قبل افراتفری اور جبریت سے مملو تھی۔
- انیسویں صدی کے آخر کے بہت سے برطانوی مورخین نے ہندوستان کے بارے میں ڈارون کا سماجی نظریہ (Social Darwinist nation) اپنایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر تاریخ مختلف لوگوں اور تہذیبوں/ثقافتوں کے درمیان مختلف مخلوقات کے مابین کشمکش کے مانند ہے تو برطانیہ سب سے اعلی مقام پر ہے اور لامحالہ سب سے بہتر تصور کیا جاسکتا ہے اور حکومت کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا ہے۔
- بہت سے برطانوی مشاہدین کی رائے میں ہندوستان ایک جامد سوسائٹی ہے اور ترقی کے ایک مرحلے پر رک گیا ہے۔ مزید یہ کہ برطانوی حکومت اونچی سطح تک ترقی کے لیے رہنمائی کرے گی۔ اس لیے ہندوستان کے لیے سالم برطانیہ (Pax Britannica) کی ضرورت محسوس کی گئی۔
- تاریخی بیانیوں میں سلطنت کے معماروں اور ہندوستان کے حکمرانوں کی اطیریت سامراجیت کے بیان کا حصہ تھا۔ جیسا کہ ارک اسٹوکس (Eric Stokes) نے نشان زد کیا ہے کہ ہندوستان پر برطانوی تحریروں میں توجہ کا مرکز برطانوی کرداروں پر تھا اور پورا ملک اور اس کے عوام دور پس منظر میں تھے۔
- حسب توقع استعماری تاریخ نویسی نے شروع میں ہندوستانی قومیت پرست تحریک کی جانب تنقیدی رویہ اپنایا تھا کیوں کہ اسے ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعہ کیے گئے اچھے کاموں کے لیے خطرہ سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں جب تحریک میں شدت آئی تو ان کا رویہ اور پیچیدہ

ہوگیا، کیوں کہ کچھ مورخین نے بہت ہی جارحانہ رویہ اپنایا اور جب کہ دوسرے مورخین ہندوستانی قومیت پرستی کی تذلیل میں کچھ زیادہ ہی چابکدست تھے۔ عام طور سے اس میں سے کچھ خصائص اور نمونے مشترکہ طور پر استعماری تاریخ نویسی کے مباحث میں پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے بے توجہی مناسب نہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں تاریخ نویسی نے ان سے چھٹکارا حاصل کیا یا کم از کم ان سے اور زیادہ بہتر تاریخ پیش کی۔

خلاصہ کلام یہ کہ استعماری تاریخ نویسی ہندوستان پر برطانوی حکومت کو جائز ٹھہرانے اور ثقافتی بالادستی قائم کرنے کے لیے تاریخ کو خاص مقصد کے لیے مخصوص کرنے کی نظریاتی کوشش کا ایک حصہ تھی۔

بنیادی فکر جو استعماری تاریخ نویسی کی روایت میں پیوست تھی وہ تھی شاہی حکومت کی سرپرستی میں جدید یورپ کے سول اور سیاسی سوسائٹی کے طرز پر پچھڑی سوسائٹی کی ترقی کا نظریاتی فکری نمونہ۔ برطانوی منتظمین کے مقاصد میں تعلیم کے ذریعہ سماج کے نچلے طبقے تک رسائی شامل تھی نیز انگریزوں کے خیال میں ہندوستانیوں کے لیے موزوں اداروں اور قوانین کا قیام اور عوام میں غلط قومیت پرستی کے خطرے سے سالم برطانیہ (Pax Britannica) کی حفاظت ان کی رہنمائی کرنے والے مقاصد تھے۔ ہندوستان کی سست رفتار ترقی کے لیے ان اجزاء کی ضرورت تھی۔

تاریخ نویسی میں منعکس نوآبادیاتی نظریہ کی دانشورانہ روایت کیا تھی؟ بینتھمی یا افادیت پرست (Benthamite or Utlitarians) سیاسی فلسفہ نے برطانیہ کے لیے ایک سرپرست کا کردار مختص کیا جس کا ایک پس ماندہ ماتحت ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیرمی بینتھم (Jeremy Benthan) نے تمام لوگوں کو یورپی یا اس کے ماسوا روشنی میں دیکھا۔ اس میں جزوی صداقت ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے استعماری ملک میں اس رویہ کا اور واضح بیان اور عملی جامہ پہنانا ممکن ہے۔ استعماری مورخین کے متاثر ہونے کا دوسرا اہم ذریعہ سماجی ڈارون ازم (Social Darwinism) تھا جس ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس نے اس خیال کی سائنٹفک قبولیت کو ظاہر کیا کہ بہت سے ہندوستانی کافی پچھڑے ہوئے تھے۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ محصور تہذیب کے ستائے ہوئے تھے اور اسے ڈارونی جبریت (Darwinian determinism) کا ناگزیر نتیجہ مان لیا گیا۔ تیسرا اہم اثر ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کا تھا۔ اس نے یورپ کی برتری کی توضیح کے لیے ایک ارتقائی اسکیم پیش کیا اور اس کے تقابلی طریقہ کار نے اعلی یورپی حوالے سے ملکوں اور تہذیبوں میں ترقی کے فرق کو ظاہر کیا۔ اہل یورپ کا یہ مشترکہ مفروضہ تھا کہ یورپی سامراجی طاقت کے تعاون سے غیر یورپی سماج ارتقائی طریقہ کی اتباع کریں گے۔ یہ ذہنیت صرف برطانوی-ہندی مورخین کے لیے مختص نہیں تھی۔ وکٹوریائی سامراج کے زمانہ عروج میں انگریزوں نے ان خیالات کا کھل کر اظہار کیا جب کہ بعد میں اس طرح کا بیان زیادہ احتیاط طلب ہوگیا۔ 1870s کی دہائی میں فٹز جیمس اسٹیفن (Fitzjames Stephen) نے ''کفر اور جہالت'' (Heathenism, Barbarism) کی بات کی اور اس کے برعکس انگریزوں کو ''ثقافت کا محافظ'' بتایا۔ 1920 کی دہائی میں ڈیوڈ ڈوڈویل (David Dodwell) کا بیان زیادہ معتدل ہے۔ تقریباً افسردگی و بے کیفی کے لہجے میں ہے۔ ہندوستان میں انسانیت کے بڑے بوجھ کو اونچی بلندی تک پہنچانا انگریزوں کا مشکل اور نا ختم ہونے والا مشغلہ تھا۔ اور یہ حصہ پرانی بگڑی حالت میں لوٹنے کے لیے آمادہ ہے۔ یہ وہ چٹان ہے جسے آپ دستہ و بیرم سے اٹھانا چاہتے ہیں۔

(Dodwell-A Sketch of the History of India: 1858-1987)

19.5 استعماری ہندوستان میں تاریخی تحریروں کے اثرات

Impact of Historical Writings in Colonial India

اوپر ذکر نظریاتی خصائص کا اطلاق استعماری مکتبۂ فکر کے تاریخی افکار کے غالب رجحان پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا بلاتفریق اطلاق غلط ہوگا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی ہندوستان کی حکومت میں تھامس منرو (Thomas Munro) اور چارلس ٹرویلین (Charles Trevelyan) جیسے مشہور برطانوی آفیسر تھے جو عوام الناس کے تئیں ہمدردی کے لیے مشہور تھے۔ گرچہ آفیسر کی حیثیت سے انھوں نے ایک استحصالی اور بیرونی (Alien) حکومت کی خدمت کی۔ کچھ برطانوی آفیسر اور مشنری تھیں جو نیشنل کانگریس سے ہمدردی رکھتی تھیں (جیسے کہ سی۔ایف اینڈروز

(C.F. Andrews) جس نے 1925 میں Renaissance in India تحریر کی) اور گیراٹ (Garratt) ایک سول سرونٹ جس نے بعد میں انگلینڈ میں لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور جارج اورویل (George Orwell) ایک انڈین پولس سروسز آفیسر جیسے لوگ بھی تھے جو بادشاہت کے مستقل ناقد تھے۔ مورخین کا بھی معاملہ ایسا ہی تھا۔ لیکن برطانوی راج کے نوکروں میں غالب روایت کے مقابلہ میں شخصی رجحان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سرکاری ہمت افزائی اور کفالت اس طرح کی تاریخ کی تھی جس میں شاہی طاقت کو جائز ٹھہرایا گیا ہو اور جو اس کی تبلیغ و ترویج میں معاون ہو جب کہ مخالف افراد کو صرف ہمسروں کی منظم اور بے تکلفانہ رائے پر قانع ہونا پڑتا تھا۔ استعماری تاریخ نویسی کی جڑوں میں نظریہ کی اہمیت کے بیان میں غالب رجحان کا ذکر ہے جو پورے طور سے ہر مورخ پر لاگو نہیں ہوتا ہے۔ تاریخ نویسی کے ضمن میں اس طرح کی صلاحیت خاص طور سے ضروری ہے۔ یہ ایک موقع ہے جہاں تاریخ کے طالب علم کو عمومی بنانے کے حدود اور دائرہ کے بارے میں اپنے فیصلے کا اظہار کرنا چاہیے۔

اس کا ذکر ضروری ہے کہ برطانوی ہندوستان میں تاریخ نویسی میں استعماری نظریہ کی شمولیت کے باوجود ہندوستان کے برطانوی مورخین نے کچھ مثبت خدمات انجام دیں۔ اس روشن حقیقت کے علاوہ استعماری مورخین نے جدید یورپ مین ترقی یافتہ طریقوں کے مطابق تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی۔ ایشیاٹک سوسائٹی اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (Asiatic Society and Archaeological Survey of India) جیسے اداروں میں ہندوستانی مورخین کا اس پیشہ اور علمی تحقیق کے میدان میں داخلہ دلانا ایک قابل قدر خدمت تھی۔ مزید یہ کہ نسلی تقابلی پر اور انتظامی مرکزیت (Statist) پر مبنی تعصب کے باوجود استعماری برطانوی مورخین کی جمع کردہ معلومات اور قدیم دستاویزات کا استعمال ایک اہم ماخذ تھا اور باقی ہے نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی تینوں یونیورسٹیوں کی ابتداء (1857-1858) سے ہی تاریخ کی تدریس شروع ہوئی۔ اس کے کچھ ناغیر متوقع نتائج بھی ہیں۔

نوآبادکاروں کی نگرانی میں پڑھائی جانے والی تاریخ سامراجی نظریہ کے حق میں کافی متعصب تھی۔ درسی کتب استعماری تاریخ نویسی کے مکتبۂ فکر کی تیار کردہ تھیں۔ پھر بھی اس کا ایک مثبت نتیجہ بھی تھا۔ اول ہندوستانی طلبہ جیمس مل اور الفی اسٹون (James Mill or Elphistone) کی ہندوستانی تاریخ کے ساتھ انگلینڈ اور یورپ کی بھی تاریخ پڑھتے تھے۔ اس طرح ہندوستانی تعلیم یافتہ کے اذہان میں آزادی، جمہوریت اور مساوات کے خیالات گھر کرتے تھے جیسا کہ یورپی تاریخ میں واضح کیا گیا ہے۔ میگنا کارتا، عظیم انقلاب، امریکہ کی جنگ آزادی، اٹلی میں ماذنی اور گری بالڈی (Mazzini and Garibaldi) وغیرہ کا ذکر ان کے لیے سبق آموز تھا۔ جو بھی ہندوستان میں قومیت پرستی کی ترقی کے اعتدال پسند مرحلہ سے واقف ہے وہ تاریخ کے مطالعے سے حاصل کردہ ان افکار کی معنویت کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے پیشہ ور تربیت یافتہ ہندوستانی مورخین تاریخ نویسی سے وابستہ ہونا شروع ہو گئے۔

تیسری اور بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کی برطانوی سول سرونٹ مورخین کی تاریخی کتابیں جو ہندوستانی طلبہ کو پڑھنی پڑتی تھیں جس نے طلبہ میں اس تاریخ نویسی کے خلاف شدید ردعملک پیدا کیا۔ ہندوستانی یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ بنکم چندر چٹرجی نے برطانوی ترجمانی کی تصحیح کی اور یہ سوال اٹھایا کہ ہم اپنی تاریخ خود کب لکھیں گے؟ ربندر ناتھ ٹیگور نے اس کو بہت ہی فصیح انداز میں بیان کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں تاریخ ملک کو اہل وطن کے سامنے ظاہر کرتی ہے جب کہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی ہندوستانی تاریخ ہندوستان کے بارے میں ہمارے رویاء (Vision) کو دھندلا کرتی ہے۔ ہم اپنے مادر وطن کو اس تاریخ میں دیکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ہندوستان میں دانشوروں کا یہ ردعمل نرالا تھا۔ اس نے سب سے بہتر قومیت پرست اذہان کو تاریخ کے نئی تعبیر کی تلاش میں رہنمائی کی۔ اس طرح ہندوستانی تاریخ کی قومیت پرستانہ ترجمانی کی راہ ہموار ہوئی اور برطانوی استعماری تاریخ نویسی کی بالادستی کا خاتمہ ہوا۔ تاریخ نویسی قومی تشخص کے شعور کی تعبیر کا ایک اہم ذریعہ ہوا۔ اس انتخاب کے اگلے یونٹ میں تاریخ نویسی کے قومیت پرست مکتبۂ فکر (Nationalist School of Historiography) کا جائزہ لیا گیا ہے۔

IMC LIBRARY Hyderabad

19.6 خلاصہ Summary

استعماری تاریخ نویسی کی اصطلاح دو معنوں میں مستعمل ہے۔ ایک کا تعلق استعماری ممالک کی تاریخ سے ہے۔ جب کہ دوسرے کا تعلق ان کاموں سے ہے جن پر استعماری نظریے کا غلبہ ہے۔ یہ دوسرا معنیٰ ہے جس میں آج کل کے بہت سے مورخین استعماری تاریخ نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ درحقیقت استعماری آفیسروں کے ذریعہ نو آبادیاتی ممالک کے بارے میں لکھنے کا تعلق تسلط کی خواہش اور استعماری نظام کو جائز ٹھہرانے سے ہے۔ اس لیے اس طرح کے اکثر کاموں میں ہندوستانی سماج اور ثقافت کی تنقید ہے۔ ساتھ ہی یورپی ثقافت اور اقدار کی تعریف اور ہندوستان میں بادشاہت قائم کرنے والے افراد کی ستائش ہے۔ جیمس مِل، ماونٹ اسٹورٹ الفی اسٹون وینسنٹ اسمتھ اور دوسرے مورخین کی لکھی ہوئی کتابیں اس رجحان کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انھوں نے تاریخ نویسی کا استعماری مکتبۂ فکر (Colonial School) قائم کیا۔ جس نے عوام کی تذلیل اور سامراج ملک کی توصیف کی۔ اس طرح کے تذکروں میں ہندوستان ایک جامد سماج، پس ماندہ تہذیب اور ثقافت کا حامل بنا کر پیش کیا گیا ہے جب کہ برطانیہ کی تعریف محرک ملک، اعلیٰ تہذیب کا حامل اور سائنس وتکنالوجی میں ترقی یافتہ کہہ کر کی گئی۔

19.7 مشقیں Exercises

(1) استعماری تاریخ نویسی کیا ہے؟ استعماری تاریخ نویسی سے وابستہ کچھ مورخین کے اہم کاموں پر بحث کیجیے؟

(2) کیا آپ کے خیال میں استعماری یا برطانوی مورخین کی ہندوستان پر لکھی ہوئی تمام تحریروں کا تعلق تاریخ نویسی کے استعماری مکتبۂ فکر سے ہے؟ جواب مثالوں کے ساتھ دیجیے۔

(3) استعماری تاریخ نویسی میں شامل استعماری نظریہ کے بنیادی عناصر پر بحث کیجیے۔

MEDIA CENTRE LIBRARY
MA-0...
03.08.201...

یونٹ 20: قومیت پرست طرز رسائی
Unit 20: Nationalist Approach

Structure	خاکہ
20.1 Introduction	20.1 تعارف
20.2 Colonial Versus Nationalist Historiography	20.2 استعماری بالمقابل قومیت پرست تاریخ نویسی
20.3 Nationalist History of Ancient and Medieval Periods	20.3 عہد قدیم وسطی کی قومیت پرست تاریخ
20.4 Nationalist History of Modern Period	20.4 عہد جدید کی قومیت پرست تاریخ
20.5 Summary	20.5 خلاصہ
20.6 Exercises	20.6 مشقیں

20.1 تعارف — Introduction

یہ بہت پیچیدہ مسئلہ کا سادہ بیان ہے خاص طور سے کیوں کہ تاریخ نویسی دونوں تاریخ وانسانوں اور واقعات ودانشورانہ تاریخ کا ایک پہلو ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہم جب کسی مورخ کے تاریخی طرز رسائی سے بحث کرتے ہیں تو اس کی سنجیدگی اور ایمانداری پر کبھی بھی سوال نہیں اٹھایا جاتا ہے۔ کوئی قابلِ ذکر مورخ کسی مخصوص فائدے کی غرض سے نہیں لکھتا ہے گرچہ یہ صحیح ہے کہ مورخ کے کام میں کسی طبقہ، ذات، یا سماجی یا سیاسی گروہ کے فکر کا انعکاس ہوسکتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر داشورانہ وابستگی یا نظریات وافکار کے زیر اثر لکھتا ہے۔ مورخ اکثر و بیشتر طبقہ، ذات، نسل، فرقہ، قوم جس میں وہ پیدا ہوا ہے اس سے ماورا ہوجاتا ہے۔

اس لیے کسی مورخ کا ہندوستانی تاریخ کے کسی مخصوص طرز رسائی مثلاً نوآبادیاتی-قومیت پرست، اور تعصب پسند طرز رسائی سے ٹھوس رشتہ کی اس کی دانشورانہ تخلیق اور نوآبادکاروں، قومیت پرستوں اور تعصب پسندوں کے ٹھوس عمل کے مابین توافق کو دیکھ کر کی جاتی ہے نہ کہ تجزیہ کر کے یا اس کے مقاصد کی تفتیش کر کے اکثر و بیشتر مورخ یا دانشور موجودہ سیاست اور نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔

یقیناً دانشورانہ تاریخ کا ایک اہم پہلو اس کا مطالعہ بھی ہے کہ مخصوص خیالات، طرز رسائیاں اور نظریات کا انتخاب کس طرح اور کیوں ہوتا ہے۔ اور عام کیا گیا۔ حمایت و مخالفت میں بحث کیوں اور کیسے ہوئی، کس طرح غالب ہوا اور کیسے غلبہ ختم ہوا یا ایک ماحول میں ابھرتے نظریات دوسرے ماحول میں کس طرح اور کیوں اپنائے گئے۔

20.2 استعماری بالمقابل قومیت پرست تاریخ نویسی
Colonial Versus Nationalist Historiography

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی تاریخ کی قومیت پرست طرز رسائی کا مقصد قومیت پرست فکر کی نشو ونما اور مذہبی، ذات یا لسانی اختلافات یا طبقاتی اختلافات کے پیش نظر عوام کو متحد کرنا تھا، جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے ک یہ کبھی کبھار مصنف کے مقصد کے قطع نظر ہوسکتا ہے۔

ابتداء 19 ویں صدی میں ہندوستانی مورخین نے یہ سوچتے ہوئے استعماری تاریخ نویسی کی اتباع کی کہ تاریخ حقیقت کی تلاش پر مبنی، سیاسی

تاریخ پر زور اور وہ بھی حکمراں خاندانوں کی تاریخ سائنٹفک ہے۔ استعماری مصنف و مورخ جنھوں نے آخر اٹھارہویں اور ابتدائی انیسویں صدی سے ہندوستان کی تاریخ لکھنی شروع کی تھی ایک طرح سے انھوں نے پورے ہندوستان کی تاریخ تخلیق کی جس طرح وہ ایک پورے ہندوستان کی بادشاہت تخلیق کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی جس طرح استعماری حکمرانوں نے خطہ اور مذہب کی بنیاد پر ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی سیاسی پالیسی اپنائی تھی ٹھیک اسی طرح استعماری مورخین نے پورے ہندوستانی تاریخ میں خطے اور مذہب کی بنیاد پر ہندوستانیوں کی تقسیم پر زور دیا۔ قومیت پرست مورخین نے بھی یا تو مجموعی طور سے ہندوستان کی تاریخ لکھی یا ہندوستان کے مختلف خطوں کے حکمرانوں کی تاریخ لکھی۔ ساتھ ہی ان کے مذہب یا ذات یا لسانی وابستگی پر بھی زور دیا۔ لیکن جس طرح استعماری تاریخ بیانیے منفی ہوگئے یا ہندوستان کی سیاسی اور سماجی ترقی کے تئیں منفی نظریہ اپنایا اس کے برعکس ہندوستانی مورخین کا قومیت پرستانہ ردعمل سامنے آیا جو استعمار پسندی کو صحیح ٹھہرانے کے نظریے کے خلاف تھا۔ استعماری مورخین استعماری پش پا افتادہ چیزیں روز بروز ہندوستان پر تھوپتے جارہے تھے۔ قدیم ہندوستان پر جیمس مل کی اور وسطی ہندوستان پر ایلیٹ (Elliot) اور ڈاوسن (Dawson) کی تحریریں ان ضمن میں بنیادی کتب تھیں۔ ہندوستانی قومیت پرست مورخین متبادل پیش پا افتادہ (Stereotypes) چیزوں کی تخلیق پر آمادہ تھے جو اکثر و بیشتر ان پر روز بروز تھوپی جانے والی چیزوں کی مخالفت کے لیے تیار کی گئی تھی جس طرح ہندوستانی قومیت پرست تحریک استعمار پسندی کی مخالفت کے لیے وجود میں آئی تھی اس طرح قومیت پرست تاریخ نویسی استعماری تاریخ نویسی کے جواب میں اور اس کے مقابلے میں رونما ہوئی اور ہندوستانی عوام اور ان کے تاریخی ریکارڈ کی استعماری تذلیل کے پیش نظر قومی خودی کی تعمیر کی کوشش بھی قومیت پرست تاریخ کے مقصد میں شامل تھی۔ طرفین نے اپنی روزانہ کی تحریر وتقریر میں تاریخ سے استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ بہت ہی مبہم یا غیر واضع تاریخی معاملات کے ذکر میں بھی ہندوستانی مورخین اپنے جواب میں پہلے کی یورپی تعبیروں پر اکثر بھروسہ کرتے تھے۔

مثلاً بہت سے استعماری مصنفین اور منتظمین کا دعوی تھا کہ ہندوستانی عوام کو ان کے تاریخی تجربات نے اختیاری حکومت اور جمہوریت یا قومی اتحاد اور قومی تشکیل یا جدید معاشی ترقی یہاں تک کہ بیرونی لوگوں کے حملے کے خلاف دفع کے لیے نااہل بنادیا ہے۔ استعماری نظام ان کو ان کاموں کے لیے دھیرے دھیرے تیار کرے گا جیسا کہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جدید خطوط پر ہندوستان کی ترقی کے لیے استعماری حکمرانوں اور نظام کی مستقل موجودگی کی ضرورت کا کبھی ضمناً اور کبھی واضح لفظوں میں دعوی کیا گیا۔ مفاد پرستوں (Utilitarians) اور مشنریوں نے تو ہندوستانی تہذیب کو برا بھلا کہا لیکن مستشرقین (Orientalists) نے فلسفیوں اور روحانی لوگوں کی موجودگی سے ہندوستان کے کردار کو اجاگر کیا۔ گرچہ اس تخصیص میں توصیف کا پہلو ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ تاریخی اعتبار سے ہندوستانیوں میں سیاسی، انتظامی اور معاشی صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اس لیے ہندوستانیوں کو روحانیت پر عمل اور اس کی ترقی اور دنیا کو اس سے متاثر کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے اور انگریزوں کو سیاسی، انتظامی، معاشی معاملات کی دیکھ بھال اور بیرونی حملے کے خلاف ہندوستانی خطے کی دفع کی ذمہ دار ہونی چاہیے۔ جب بھی ہندوستان میں ہندوستانی حکمراں رہے تو بیرونی حملے کامیاب ہوئے ہیں۔ درحقیقت غیر ملکی حکمرانوں کی عدم موجودگی میں ہی ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی افراتفری کے امکان بڑھے ہیں۔ مثلاً یہ انگریز ہی تھے جنھوں نے 18ویں اور 19ویں صدی میں ہندوستان کو نراج یا لاقانونیت سے بچایا تھا۔ استعماری مصنفین اور منتظمین کا یہ بھی ماننا تھا کہ ہندوستانیوں میں اپنی مذہبی اور سماجی تنظیم کے باعث بھی اخلاقیات کی کمی ہے۔ (یہ اکثر اس حقیقت کا نتیجہ تھا کہ برطانوی انتظامیہ صرف اپنے خانساموں، سائیس اور دوسرے نوکروں یا صاحب سے تعلقات کے ذریعہ پیسہ بنانے والے نمائندوں سے سماجی تعلق رکھتے تھے)۔ کچھ یورپی مصنفین نے بھی اپنے ملک میں بڑھتی صنعت کاری اور تجارت کاری کی برائیوں کے خلاف ردعمل میں بھی ہندوستانی روح پرستی (Spiritualism) کی تعریف کی۔

بہت سے استعماری مورخین کا یہ بھی ماننا تھا کہ مشرق کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کی بھی عین فطرت میں داخل ہے کہ اس پر کسی مطلق العنان کی حکومت رہے یا کم از کم اس کا حکمراں خودمختار یا آمریت پسند ہو۔ اسی سبب سے ہندوستان میں برطانوی حکومت آمریت پسند تھی یا ہونا پڑا تھا۔ یہ نظریہ مستشرقی استبدائیت (Oriental Despotism) کے اصول کے نام سے کافی مشہور ہوا۔ مزید یہ کہ ان مصنفین کا یہ دعوی تھا کہ ہندوستان میں کسی حکمراں کا محکوم کے لیے رفاہی ہونے کے نظریہ مفقود تھا، درحقیقت ہندوستان میں روایتی سیاسی دور حکومت فطرتاً غیر معمولی طور

سے ظالم تھی۔ اس کے برخلاف برطانوی حکمراں مطلق العنان ہونے کے باوجود بھی صحیح اور فیض رساں تھے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ ماضی کے مشتشرقی استبدائیت کے برعکس برطانوی نظام فیض رساں تھا گرچہ مطلق العنان بھی تھا۔

استعماری مصنفین کا یہ بھی ماننا تھا کہ اہل یورپ کے برعکس ہندوستانیوں میں ہمیشہ سے قومیت پرستانہ فکر کی کمی تھی اسی لیے قومی اتحاد کی بھی کمی تھی، ہندوستانی ہمیشہ گروہوں میں منقسم تھے۔ ان کے مطابق ہندوستانیوں میں جمہوری روایت کا بھی فقدان تھا۔ جب کہ اہل یورپ قدیم یونان و روم کی جمہوری روایت سے مستفید ہو چکے تھے۔ استبدائیت درحقیقت مشرق کے تمام ہندوستانیوں کی وراثت تھی، ہندوستانیوں میں تخلیقی اور اختراعی صلاحیتوں کی بھی کمی تھی۔ نتیجتاً ادارے، ریت و رواج، فن اور ہنر جیسی اہم چیزیں باہر سے آئی ہیں جیسے ہندوستان میں نظم ونسق، قانونی مساوات، معاشی ترقی سماجی مساوات کے نظریہ پر مبنی سماج کی جدید کاری استعماری نظام ہی کی دین ہے۔

ان استعماری نظریات سے نہ صرف ہندوستانی مورخین اور دوسرے دانشوروں کو تکلیف پہنچی بلکہ اس کا ضمناً یہ بھی مطلب ہوا کہ حکومت خود اختیاری، جمہوریت، قانونی اصلاح وغیرہ کا ہندوستانی دانشوروں کی بڑھتی مانگ ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے باعث ہی غیر حقیقی تھی۔ بہر حال جمہوریت ان کے تاریخی کردار کے لیے اجنبی تھی اور اسی لیے ان کے لیے موزوں نہیں تھی۔

20.3 عہد قدیم و وسطیٰ کی قومیت پرست تاریخ

Nationalist History of Ancient and Medieval Periods

قومیت پرستی سے متاثر بہت سے ہندوستانی اور کچھ یورپی لوگوں نے انیسویں صدی کے نصف آخر سے استعماری رسمی چیزوں کی تفتیش کو اصل میں ایک چیلنج کی طرح لیا۔ انھوں نے تفصیل اور باریک بینی اس تحقیق کی بنیاد رکھی۔ جس نے حقائق وتفصیلات سے والہانہ وابستگی اور ہندوستانی تاریخی موضوع میں بنیادی ماخذ پر بھروسہ کی عمدہ روایت قائم کی۔

ہندوستانی مورخین نے موجودہ تاریخی ماخذ کے تجزیہ کی بنیاد پر استعماری تاریخی بیانیوں کی غلط بیانیوں کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی نئے ماخذ کی تلاش بھی شروع کی۔ یقیناً قومی وقار کے مجروح ہونے کے احساس نے بھی ان کو اس پر آمادہ کیا۔ کئی دہائیوں تک ان کا کام قدیم اور وسطیٰ عہدوں تک محدود رہا۔ پیشہ ور مورخین نے دو اسباب کی بنا پر عہد جدید تو نہیں اپنایا جب کہ ماہرین معاشیات نے اس موضوع پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔

(1) اس میں سے اکثر حکومت یا حکومت کے زیر انتظام اسکول و کالج میں کام کر رہے تھے اور ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ نو آبادیت کی تنقید ان کے کیریئر کو متاثر کر سکتی ہے۔

(2) انھوں نے موجودہ برطانوی تاریخی نظریہ کو قبول کر لیا تھا کہ سائنٹفک تاریخ کو موجودہ اور عصر حاضر سے نہیں بحث کرنی چاہیے۔

روحانیت پرستی کی ہندوستانی روایت کے بارے میں استعماری نظریہ کو ہندوستانی مورخین نے مغرب پر برتری، ہندوستان کی عظمت اور نشان امتیاز سمجھا۔ خاص طور سے مغربی تہذیب کی مادہ پرستی کی خصوصیت کے مقابلے میں ''اخلاقی اقدار'' کے حوالے سے (بحث طلب بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متوسط طبقہ کو جن کا تعلق ساہوکاروں اور تجارتی گھرانوں سے تھا اور جو مالی منفعت کے لیے کوشاں تھے، کافی متاثر کیا)۔

ساتھ ہی انھوں نے ہندوستانیوں کی روحانیت سے دلی وابستگی کو تسلیم نہیں کیا اور نظام، نظام حکومت، سفارت، تعمیر شہنشاہیت، فوجی نظام، ٹیکس عائد کرنے کا خاکہ، جنگی معاملات، زرعی، صنعت اور تجارتی ترقی میں ان کی اہلیت پر زور دیا۔ بہت سے مورخین نے ہندوستان کی قدیم سفارتی اور سیاسی اداروں اور موجودہ یورپ کے اداروں میں مماثلت تلاش کی۔ انھوں نے قدیم ہندوستان کا ملک چلا پانے کی نا اہلیت کے خیال کی زبردست مخالفت کی۔ انھوں نے بیسویں صدی کے ابتداء میں کوٹیلیا کی ''ارتھ ساشتر'' کی کھوج کو سراہا اور کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی نظام، سفارت، اور ملک کے ذریعہ معاشی انتظام میں اس طرح دلچسپی اور دسترس رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے کوٹلیا کی مدح سرائی کی اور میکاولی (Machiavelli) اور بسمارک (Bismark) سے موازنہ کیا۔ بہت سے لوگوں نے ریاست پر مذہب کے غلبہ سے انکار کیا اور

ریاست کے سیکولر کردار پر زور دیا۔ انھوں نے قدیم ہندوستان کے مطلق العنان اور استبدائیت کے خیال کی تردید کی۔ ان کے مطابق قدیم ہندوستان میں بادشاہ سب کے ساتھ انصاف کرتا تھا۔ دوسروں نے اس خیال کی تردید کی کہ ہندوستانی حکمراں عوام کی رفاہ کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے ریاست میں عوامی عنصر (Popular element) کی موجودگی کا زبردست دعویٰ کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ بہت سے معاملات میں سیاسی ڈھانچہ جدید جمہوریت سے ملتا جلتا تھا۔ ان سبھی کا دعویٰ تھا کہ حکومت کسی بھی معاملہ میں غیر ذمہ دار اور من موجی نہیں تھی۔ شخصی حکومت یا بادشاہ کے اختیار پر بہت سی پابندیاں تھیں۔ بہت سے ذرائع تھے جن کے ذریعہ رائے عامہ موثر ہوئی۔ کچھ نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی شاہی حکومت/بادشاہت محدود تھی اور اکثر دستوری بادشاہت (Constitutional Monarch) سے ملتی جلتی تھی۔ جیسے کوٹیلیا کے بیان کردہ منتری پریشد کا موازنہ برطانیہ کے پراوی کونسل (Privy Council) سے کیا جاتا تھا۔ مجموعی طور سے اکثر مقامی خود اختیاری حکومت (Local self government) کی موجودگی کا دعویٰ کیا جاتا تھا اور جمہوری طور سے منتخب گاؤں پنچایت کی مثال دی جاتی تھی۔ کچھ مصنفین نے تو اسمبلیوں، پارلیمنٹ اور کابینہ کی موجودگی کی حد تک بات کی اور چندر گپت اکبر اور شیواجی کی مثال دی۔ اکثر و بیشتر بادشاہوں کی عالمی قانون کی پابندی کو نشان زد کیا ہے۔ خاص طور سے جنگ کے معاملے میں انھوں نے ہندوستانی بادشاہوں کی آمرانہ ٹیکس عائدگی کے الزام کی تردید کی اور یہ دعویٰ کیا کہ ٹیکس کا نظام دراصل جدید جاری ٹیکس کے نظام کے مماثل تھا۔ بیسویں صدی کے اول ربع کے مشہور مورخ کے۔ پی۔ جیسوال (K.P. Jayaswal) نے اس پوری طرز رسائی کو منتہا تک پہنچایا۔ 1915 میں شائع اپنے Hindu Polity میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ قدیم ہندوستانی نظام یا تو جمہوری تھا یا دستوری بادشاہت۔ ان کا حاصل کلام یہ تھا کہ ''ہندوؤں نے جو آئینی ترقی کی اس کا قدیم سیاسی نظام میں کوئی ثانی نہیں ہے چہ جائے کہ اس سے بہتر یا آگے'' (یہ اہل یورپ کا خیال کہ یونان سے جمہوریت کی ابتداء ہوئی کے جواب میں تھا)

بنیادی طور سے قومیت پرست طرز رسائی اس دعوے کے لیے تھی کہ جو کچھ یورپ میں سیاسی اعتبار سے مثبت چیزیں ہیں وہ پہلے سے ہندوستان میں موجود تھیں۔ اسی لیے آر۔ سی مجمدار (R.C. Majumdar) نے اپنی کتاب Corporate life in Ancient India میں لکھا ہے کہ ''جن اداروں کی نشوونما ہم مغرب میں دیکھنے کے عادی تھے وہ ہندوستان میں بھی بہت پہلے تناور ہو چکے تھے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ مغرب کی اقدار کا نظام قبول کرلیا گیا۔ یہ قدیم ہندوستانی سیاسی ادارے نہیں تھے جن کو مجموعی طور سے عظیم تسلیم کیا گیا بلکہ مغربی اداروں کی عظمت بھی تسلیم کی گئی اور پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ قدیم ہندوستان میں بھی موجود تھے۔

استعماری مورخین کا یہ دعویٰ تھا کہ ہندوستانی مذہب، علاقہ، زبان اور ذات میں بٹے ہوئے تھے اور ان استعمار پسندی نے متحد کیا اور اگر استعماری نظام/استعماری حکومت ختم ہو جائے تو ہندوستانیوں کا اتحاد بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ہندوستانیوں میں وطن پرستی اور قومی اتحاد کی کمی ہے۔ قومیت پرست مورخین نے یہ دعویٰ کر کے استعماری نظریہ کو رد کیا کہ ماقبل استعماری ہندوستان میں ثقافتی، معاشی اور سیاسی اتحاد نیز ہندوستانی قومیت کا احساس حاوی تھا، انھوں نے کہا جیسے کوٹیلیا نے ارتھ شاستر میں ایک ملکی بادشاہ (National King) کی ضرورت کی وکالت کی تھی۔ ماضی میں ہندوستان کے اتحاد کے دعوی کی ضرورت سے کسی حد تک اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہندوستانی مورخین نے کیوں ہندوستانی تاریخ کو ہندوستانی شہنشاہیت اور اس کے بکھراؤ کی تاریخ کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی اور کیوں شہنشاہت کے عہد کو قومی عظمت کے عہد سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال میں چندر گپت موریہ، اشوک، چندر گپت وکرم دتیہ اور اکبر عظیم تھے کیوں کہ انھوں نے عظیم شہنشاہیت کی تعمیر کی، ایک جانب ہندوستان کی تعریف اہنسا کا ملک کی حیثیت سے کی جاتی تھی جب کہ دوسری جانب شہنشاہیت کے معماروں کی فوجی قوت کی بھی تعریف کی جاتی تھی۔ اس کا عجیب وغریب نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مورخین نے اشوک کی عدم تشدد سے وابستگی کی تعریف کی اور بعض نے اس کے لیے اس کی مذمت بھی کی کیوں کہ اس سے بادشاہت بیرونی حملہ آوروں کے خلاف کمزور ہو گئی تھی۔

قومیت پرستوں نے ہندوستانی ثقافت اور سماجی ڈھانچے کی موافقت میں لکھا۔ اس کے بدلے انھوں نے نچلی ذات پر جبرا سماجی، معاشی استحصال اور مردوں کے غلبہ کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کیا، اس کے علاوہ دنیا میں تہذیب کی ترقی میں ہندوستان کی خدمات پر صحیح طور سے زور دیا لیکن ہندوستان کی ترقی میں دوسری تہذیب و ثقافت کے اثرات کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ سیاسی اداروں کی طرح اکثر سماجی اقدار

اور اداروں کو تسلیم کیا گیا اور پھر یہ معلوم ہوا کہ یہ قدیم ہندوستان میں موجود تھے۔

اس کی تاریخی صداقت، جس پر یہاں بحث نہیں کی جاسکتی، کے علاوہ قدیم ہندوستان پر قومیت پرست مورخین کی طرز رسائی کے کچھ سخت منفی نتائج تھے (1) انسانی کاوشوں کے مختلف میدانوں میں ہندوستانی عوام کی کامیابیوں کو تقریباً قدیم عہد سے جوڑا جاتا تھا (2) سنسکرتی و برہمنی شکلوں میں ہندو تہذیب اور سماجی ڈھانچے پر زور دیا ن جتاتا تھا۔ (3) ماضی کی ستائش تعصب پسندی اور پھر بعد میں علاقائیت میں ضم ہونے کے امکان ہوئے۔ بہر حال 1930 کی دہائی کے اوائل میں ہندوستانی تاریخ کے عہد قدیم پر ہندوستانی تاریخ نویسی عروج پر تھی۔ بعد میں یہ زیادہ سے زیادہ پہلی تحریروں کا چربہ ہی رہا۔

1920 اور اس کے بعد خاص طور سے وسطی ہندوستان کی قومیت پرست تاریخ نویسی کی ترقی ہوئی۔ اور زیادہ سے زیادہ نو آبادیاتی اور تعصب پسند طرز رسائی کی مخالفت کی۔ وسطی ہندوستان کے قومیت پرست مورخین نے قدیم ہندوستانی تاریخ کے متعلق کم و بیش قومیت پرستوں کے طرز رسائی کا اعادہ کیا۔ خاص طور سے انھوں نے عوام اور خواص کی سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی عمل کے نتیجے میں ہونے والی شمالی ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی ترقی پر زور دیا۔ انھوں نے استعماری۔تعصب پسندوں کے اس دعوے کی بھی تردید کی کہ مسلم حکمراں ملک میں سکونت اختیار کرنے کے بعد میں غیر ملکی/ خارجی بنے رہے یا وہ پیدائشی ظالم تھے یا باقی دنیا کے اہم عہدوں پر فائز لوگوں اور اسلاف کے مقابلے زیادہ تشدد پسند تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تصادمی کیفیت یہاں تک کہ ایک دسرے کا جانی دشمن ہونے کی تردید کی۔

ہندوستان کے ماضی کی ستائش اور استعماری تذلیل کے خلاف ہندوستانی تہذیب کے دفع کے رجحان کے علاوہ بہت سے قومیت پرست مورخین نے اس سوال کا جواب بھی تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ہزاروں میل دور ایک چھوٹے ملک کی پشت پناہی سے ایک چھوٹی سی تجارتی کمپنی نے کیسے قابل رشک ماضی اور عظیم تہذیب والے ہندوستان جیسے بڑے ملک پر قبضہ کیا۔ اس نے ہندوستانی تہذیب اور سماجی ڈھانچے کی تنقید کی ابتداء کو نشان زد کیا نتیجتاً سماجی تاریخ کے مطالعہ کے جانب ابتدائی قدم اٹھانے میں معاون ہوئی۔ خاص طور سے ذات پات والے نظام اور عورتوں کی حالت کے متعلق سماجی تاریخ کے مطالعہ میں۔

استعمار پسندی (Colonialism) کے موجودہ قومیت پرست ناقدین نے ماقبل استعماری ہندوستان کی معاشی تاریخ کے مطالعہ کی جانب پہلا قدم اٹھانے میں رہنمائی کی۔ جیسے ہی قومیت پرست تحریک عوامی تحریک میں تبدیل ہوئی 1930 کے آس پاس تاریخ میں عام آدمی کے رول کی جانب توجہ ہوئی۔ پھر 1950 کے بعد ہی یہ رجحان بارآور ہوا۔

ہماری نظر اس پر بھی ہونی چاہیے کہ جن مورخین کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اپنے ماخذ و منبع کے محدود ہونے کے باعث مجبور تھے۔ ان کو تحریری ماخذ پر انحصار کرنا پڑتا تھا گرچہ کتبوں اور سکوں کے مطالعات (Epigraphy and Numismatics) نے اہم خدمات بہم پہنچانی شروع کر دیں تھی۔ علم آثار قدیمہ ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا، ساجیات اور بشریات کا استعمال ناقابل اعتنا تھا اور معاشیات کو صرف ماہرین معاشیات کا مخصوص شعبہ سمجھا جاتا تھا۔

20.4 عہد جدید کی قومیت پرست تاریخ

Nationalist History of Modern Period

قومیت پرست تاریخ نویسی خاص کر عہد قدیم و وسطی کے ذکر میں پھلی پھولی۔ یہ بمشکل عہد جدید کے بارے میں ہے۔ 1947 کے بعد ہی اس کی ابتداء ہوئی۔ 1947 سے قبل جدید ہندوستان کے قومیت پرست مورخین کا کوئی مکتبۂ فکر (School) نہیں تھا۔ یہ جزوی تھا کیوں کہ قومیت پرستی (Nationalism) کے عہد میں قومیت پرست ہونے کا ے مطلب سامراج مخالف بھی ہوتا تھا جس کا ایک مطلب برسر اقتدار استعماری نظام سے تصادم بھی تھا۔ اور تعلیمی نظام پر نو آبادیاتی نظام پر نو آبادکاری کے کنٹرول کے باعث (اکیڈمکس) مدرسین کے لیے ممکن نہیں تھا۔ 1947 کے بعد ہی سامراج مخالف ہونا محفوظ سمجھا گیا۔ نتیجتاً قومی تحریک کی تاریخ یا استعماری معیشت کی تاریخ موجود نہیں تھی۔ یہ درحقیقت 1947 سے قبل

قومیت پرست تاریخ نویسی کی عدم موجودگی کی مکمل وضاحت نہیں ہے۔ آخر کار ہندوستانی ماہر معاشیات نے ہندوستانی استعماری معیشت اور عوام پر اس کے اثرات کی تیکھی اور عمدہ تنقید کی ترویج کی۔

19ویں صدی کے ربع آخر میں غیر مدرسین (Non-academics) اور قومیت پرست ماہرین معاشیات نے استعمار پسندی (Colonialism) کی تفصیلی اور سائنٹفک تنقید کی۔ اس میں دادا بھائی نوروجی، جسٹس رانا ڈے۔ جی وی جوشی، آر۔سی۔دت، کے۔ٹی۔تلنگ، جی۔کے گوکھلے، اور ڈی۔ای واچا شامل ہیں۔ کچھ تعلیمی اداروں سے وابستہ مورخین جیسے کے۔ٹی شاہ، وی۔سی کالے، سی۔این وکیل، ڈ۔آر۔گاڈگل، گیان چند، وی۔کے۔آر۔وی راؤ، اور واڈیا اور مرچنٹ نے 20ویں صدی کے نصف اول میں ان کی اتباع کی۔ ان کے ناقدین کو تاریخ کی کتابوں میں اس عہد کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ صرف 1947 کے بعد ہوا اور وہ بھی 1960 اور اس کے بعد۔ 1920 کے بعد یہ تنقید عوامی تحریکوں کے عہد میں قومیت پرست احتجاج کی بنیاد ثابت ہوئی۔ مثلاً تلک، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور سبھاش بوس نے اس پر زیادہ تکیہ کیا۔ چند مورخین جنھوں نے 1947 کے بعد قومی تحریک اور قومیت پرست مورخین کا سرسری حوالہ دیا کے نزدیک یہ سامراج مخالف تحریک نہیں تھی۔ اس طرح قومی تحریک کی صرف وہی تاریخ تھی جو آر۔جی۔ پردھان، اے سی مجمدار، جواہر لال نہرو اور پٹابھی سیتا رمیا جیسے قومیت پرست رہنماؤں نے لکھی تھی۔ 1947 کے مابعد مورخین نے قومیت پرستی اور ہندوستانی قومی تحریک کے جواز کو تسلیم کیا لیکن استعمار پسندی کی معاشی تنقید میں اس کی بنیاد کا شاذ و نادر ہی ذکر کیا۔ انھوں نے قومیت پرست جدوجہد کے دسرے دھاروں کو گرچہ پوری طرح سے نظر انداز نہیں کیا لیکن ان کی اہمیت گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

جدید مورخین بھی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جیسے کہ تارا چندن کا ماننا تھا کہ ہندوستان انیسویں صدی سے ہی زیر تشکیل قوم ہے اور دوسرے گروہوں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے ہی ایک قوم ہے۔ ساتھ ہی ان کی عظمت یہ بھی تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی کثیر لسانی، کثیر مذہبی، کثیر نسلی اور اسی لیے کثیر ثقافتی کردار اور اس کی رنگا رنگی کو تسلیم کیا۔ مذہب اور ذات پر مبنی ہندوستانی سماج کے اندرونی تضادات یا عورتوں اور قبائلیوں کے استحصال یا ان کے ساتھ بھید بھاؤ/تعصب کو قومیت پرست مورخین نے نظر انداز کیا یا بہت ہی کم اہمیت دی۔ انھوں نے طبقہ اور ذات کے استحصال کے خلاف تحریک کو بھی نظر انداز کیا۔ انھوں نے قومی تحریک کا شاذ و نادر ہی گہرائی سے تجزیہ کیا اور اکثر وبیشتر اس کی اندھی ستائش میں ملوث رہے۔ سیکولر موقف اختیار کرتے ہوئے یا تعصب پسندی کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے اس کے کردار یا عناصر، اسباب و ترقی کا سنجیدگی سے تجزیہ نہیں کیا۔ اکثر وبیشتر اس کو برطانوی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا نتیجہ سمجھا گیا۔ انھوں نے سماجی اصلاحی تحریکوں (Social Reform Movements) کو جائز مقام دیا لیکن ان پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی اور اکثر اپنے نجات کے لیے قبائلی لوگوں اور نیچی ذات کے لوگوں کی تحریکوں کو نظر انداز کیا۔ مجموعی طور سے مورخین نے معاشی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کو نظر انداز کیا اور زیادہ سے زیادہ ان پر ایک یا دو باب شامل کر دیا اور ان کو بھی اصل بیانیوں سے منسلک نہیں کیا۔

مجموعی طور سے قومیت پرست مورخین کے متعلق مزید رائے زنی کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کے اندرونی تضادات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ وہ اونچی ذات، مردوں کی شاونیت (Male chauvinist)، تہذیبی و سماجی تعصب کے کا شکار تھے مزید آں کہ انھوں نے ہندوستانی استثنائیت کے نظریہ کو تسلیم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستانی تاریخی ترقی باقی دنیا سے پوری طرح مختلف ہے۔ وہ تاریخی ترقی میں ہندوستان کی برتری ثابت کرنے کی کوشش میں ہندوستانی سماجی اداروں کی تاریخی ترتیب بھول گئے۔ ان کی ہندوستانی تاریخ کو جیمس مل کا ہندو اور مسلمان کے ادوار میں ہندوستانی تاریخ کی تقسیم کی ان کی قبولیت ہندوستانی تاریخ کے مطالعے اور جدید ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لیے خاص طور سے منفی اور مضر تھا۔

20.5 خلاصہ Summary

قومیت پرست مورخین نے علمیت (Scholarship) کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کی بنیاد سخت تحقیق اور اپنی معلوم کردہ

صداقت سے وفاداری پر رکھی۔ انھوں نے احتیاط اور باریک بینی سے اپنے تمام بیانات حاشے میں شامل کیا۔ نتیجتاً ان کی تحریریں اکثر تجربی طور پر صحیح ہیں۔ ان کی تحقیق نے ماضی کی ہماری تفہیم وتعبیر کو آگے بڑھایا ہے۔ انھوں ے ہماری تہذیب کی نوآبادکاری کے خلاف تہذیبی دفع میں بھی خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی ان میں سے اکثر نے ہمارے سماج کی جدید کاری کے مثبت پہلوؤں میں بھی معاونت کی۔ ان میں سے اکثر نے نئے ماخذ کو بھی ڈھونڈ نکالا اور موجود ماخذ کی تعبیر کے لیے نئے طریقے پروان چڑھائے۔ انھوں نے بہت سے نئے سوالات اٹھائے، تنازع کو جنم دیا اور سرگرم بحث کی ابتداء کی۔ یہ خیال بھی ذہن نشین کردیا کہ تاریخی تحقیق وتحریر کی عصری معنویت ہونی چاہیے گرچہ اپنی تحقیق میں بہت آگے نہیں گئے۔ اس خیال کو تسلیم کیا اور ترقی دی کہ تاریخ میں عام آدمی کے کردار کو تاریخ نویسی کا اہم جزو ہونا چاہیے۔ مزید آں قومیت پرست تاریخ نویسی نے خود اعتمادی، قطعیت اور مخصوص قومی وقار میں معاونت کی جس نے ہندوستانیوں کو اس قابل بنادیا کہ وہ استعماری مصنفین کی ترقی کردہ ہندوستان کے ماضی کی تحقیر اور نتیجتاً احساس کمتری کے پیش نظر استعمار پسندی (Colonialism) کے خلاف جدوجہد کرسکیں۔ نیل کنٹھ شاستری اور دوسرے مورخین نے علاقائی تعصب سے اوپر اٹھنے میں بھی مدد کی۔ ہند-گنگا (Indo-Gangetic) میدانوں سے متصل ہندوستان کو دیکھنے کا تعصب اور دوسرے معاملوں کی طرح اس حوالے سے بھی ہندوستان میں قومیت پرست تاریخی تحریر نے خاص کر ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں کو متحد کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا۔

20.6 مشقیں Exercises

(1) استعماری اور قومیت پرست تاریخ نویسی میں فرق پر بحث کیجیے۔

(2) قدیم ہندوستان نے متعلق قومیت پرست تاریخ نویسی کی مخصوص اوصاف کیا ہیں؟

(3) جدید عہد پر قومیت پرست مورخین کی تحریروں میں بحث کیے گئے مسائل پر ایک نوٹ لکھیے۔

INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE LIBRARY MANUU HYDERABAD Acc. No. MA-0499 Date 03.08.2015
INSTRUCTIONAL MEDIA CENTRE MANUU IMC LIBRARY Hyderabad